کی زبان نہایت سلیس ہے، اور اس کے مطالعہ سے ایک لذت وحلاوت اور روحانی کیفیت محسوس ہوتی ہے، جو غالباً مصنف کی باطنی کیفیت کا اثر ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اتنے مسائل میں ہر شخص کا مجیب کلی متفق ہونا ضروری نہیں ہے، جہاں غیر مقلدین اور علمائے بریلی کے فتووں پر ردو قدح کی گئی ہے وہاں لب ولہجہ میں شدت آگئی ہے،

گل نو:- مرتبہ جناب واحد پریمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ/ پتہ: مکتبہ صبح ادب نزد مسجد ٹولوالی بھوپال ۱

جناب واحد پریمی بھوپال کے نوجوان اور خوشگو شاعر ہیں، یہ مجموعہ انکی غزلیات پر مشتمل ہے، مصنف میں شعر وسخن کا ذوق ستھرا ہے، اور انکے خیالات میں تازگی اور طرز ادا میں سادگی و دلکشی ہے، انھوں نے کہیں کہیں سیاسی حقایق اور موجودہ زمانہ کے حالات کی عکاسی اور غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کی حکایت کی ہے، لیکن یہ مصنف کا پہلا مجموعہ ہے، اسلیے بعض خیالات میں عدم پختگی اور زبان و بیان کی معمولی خامیاں بھی ہیں، جو مشق وریاض اور مطالعہ سے دور ہو جائیں گی۔

کفاک علما بالعربیۃ حصہ دوم وسوم:- مرتبہ مولانا عبد الحمید نعمانی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۳۰ قیمت عہ ۵ پیسے و ۳ ر ۲۵ پیسے۔ پتہ مدرسہ ملت مالیگاؤں ضلع ناسک، مکتبہ خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دہلی ۶

مولانا عبد الحمید نعمانی نے عربی کے مبتدی طلبہ کے لیے ایک مفید عربی ریڈر لکھی ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، یہ دوسرا اور تیسرا حصہ ہے، مصنف کو تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف دونوں کا اچھا سلیقہ اور پورا تجربہ ہے، اس لیے طلبہ کے ذوق واستعداد کے مطابق ان میں مشق وتمرین کے ساتھ عربی کے مبادیات اور ضروری قواعد مفید انداز میں لکھے ہیں، یہ عربی ریڈر عربی مدارس کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۴ - ماہ رجب المرجب ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ

شذرات

گاندھی جی کی ولادت کی صد سالہ یادگار مختلف ملکوں میں منائی جائے گی، ہندوستان میں ان کی یادگاریں بڑے بڑے جلسے ہوں گے ان میں لمبی چوڑی تقریریں ہوں گی، ان پر مضامین اور کتابیں لکھی جائیں گی، اخبارات اور رسالے خاص نمبر نکالیں گے، گاندھی جی کے مجسمے نصب کیے جائیں گے، ان کے یادگاری ٹکٹ جاری ہوں گے، اور مختلف قسم کی یادگاریں قائم کیجائیں گی، گاندھی جی کی عظمت اور انکے کارنامے بلاشبہہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں مگر یہ یادگار منانا اس وقت زیب دیتا جب گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل اور ان کا کچھ بھی پاس و لحاظ ہوتا، وہ اخلاق و روحانیت حق و صداقت اور عدل و مساوات کے بہت بڑے مبلغ تھے، ان کی نگاہ میں بلاتفریق مذہب و ملت ہندوستان کے سارے باشندے برابر تھے، وہ ہر قسم کے تعصب و تنگ نظری کے خلاف تھے، اور عمر بھر ان سے جنگ کرتے رہے، اور اس راہ میں جان تک دیدی، وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں جنت نشان بنانا چاہتے تھے جس میں ہر فرد کو امن و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں،

لیکن ان کے اس خواب کی تعبیر الٹی نکلی، ان کے نام لیواؤں تک نے انکی تعلیمات کو بھلادیا پورا ملک صوبائی، لسانی اور مذہبی تعصب و تنگ نظری میں مبتلا ہے، آئے دن کے ہنگاموں نے ملک کا امن و سکون غارت کر دیا ہے، اچھوتوں کی پستی اور درماندگی کا وہی حال ہے، اقلیتوں کا

جان و مال محفوظ نہیں، فسادوں کا ایک سلسلہ قائم ہے جن میں ہزاروں قیمتی جانیں ضائع اور کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہوتی ہیں، ہر پارٹی حکومت و اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہے، ملک کے مفاد کی کسی کو فکر نہیں، حکومت اور کانگریس دونوں ان حالات پر قابو پانے سے قاصر ہیں، اور اس کے خلاف صرف زبانی بیان دیدینا کافی سمجھتے ہیں، ان حالات میں ہم کو گاندھی جی کی یادگار منانے کا کیا حق ہے، اور ہمارے پاس انکی یادگاریں پیش کرنے کے لیے بیگناہوں کے قتل و خونریزی، انکی تباہی و بربادی اور یتیموں اور بیواؤں کے آنسوؤں کے سوا کیا ہے، ہم ساری دنیا کو تو امن اور شانتی کا پیام سناتے ہیں اور اپنے گھر کی خبر نہیں۔ ع

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

اس سے نہ صرف ملک کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہوتی ہے، رباط کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ جو نازیبا سلوک ہوا وہ اگرچہ پاکستان کی مخالفت کا نتیجہ ہے لیکن اگر احمد آباد کا واقعہ تازہ نہ ہوتا تو شاید اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوتی، ہم نے خان عبدالغفار خاں کو بڑے ذوق و شوق سے بلایا تھا، اور انکی آمد پر بڑے بڑے منصوبے ذہن میں تھے لیکن احمد آباد اور دوسرے فسادات نے انکا رخ ہی بدلدیا، اور سرحدی گاندھی پر اس کا وہی اثر ہوا جو ایک سچے گاندھیائی پر ہونا چاہیے، جن پر ان کے بیانات اور ان کا برت شاہد ہے، فرقہ پرست جب گاندھی جی کو نہیں مانتے تو خان عبدالغفار خاں کو کیا خاطر میں لائیں گے لیکن کم سے کم کانگریس اور حکومت کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اگر ان کی آمد سے یہی فائدہ حاصل ہو جائے تو بہت بڑا فائدہ ہے، احمد آباد میں جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس کی مثال درندوں میں بھی نہ ملے گی، اس نے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ہے، کاش فتنہ پرستوں پر بھی اس کا اثر ہوتا،

گاندھی جی کی سب سے بڑی یادگار، اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو زندہ اور ان کے مشن کو پورا کیا جائے، وہ جن چیزوں کے خلاف عمر بھر جنگ کرتے رہے، پورے عزم و ہمت سے ان کو مٹانے کی کوشش کیجائے، انھوں نے آزاد ہندوستان کا جو نقشہ بنایا تھا، اس کے مطابق اس کی تعمیر کیجائے، گاندھی جی نے جن اصولوں پر عمل کرکے ہندوستان کا نام بلند کیا تھا، ان ہی کے ذریعہ اس کا نام اب بھی اونچا ہو سکتا ہے، ورنہ محض ان کا نام لینے اور ان کی یادگار منانے سے کچھ حاصل نہیں،

رباط کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ جو ناز یبا سلوک ہوا، اُس سے ہر ہندوستانی کو تکلیف پہنچی، اور وہ مہمانی اور میزبانی کے اسلامی آداب و تہذیب کے سراسر خلاف ہے، اس کانفرنس سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں، وہ بھی پوری نہ ہوئیں، اور اس نے رسمی تجویزوں کے آگے قدم نہیں بڑھایا جس کا کچھ حاصل نہیں، لیکن اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مقصد کے لیے اتنے اسلامی ملکوں کے نمایندوں کا اجتماع ہوا، اگر اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو اس سے اسلامی ملکوں میں وحدت کی بنیاد پڑ سکتی ہے، یہ صحیح ہے کہ ہر ملک کے سیاسی حالات الگ الگ ہیں، لیکن ان کے علاوہ بہت سے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل مشترک ہیں، ان میں اس وحدت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس کانفرنس کو مستقل حیثیت دے دیجائے، اسلامی ملکوں کے مشترک مسائل پر غور و فکر اور تبادلۂ خیالات سب کے لیے مفید ہوگا۔

مقالات

عصامی اور اسکی تاریخ فتوح السلاطین

ازجناب ڈاکٹر محمد عبدالمنان صاحب ریڈر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، دکن

عصامی، علاء الدین حسن بہمن شاہ بانی سلطنت بہمنیہ کے عہد کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مصنف اور اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور وسیع النظر مورخ تھے، فارسی کے قدیم تذکرے اس شاعر شیوا بیان کے ذکر سے خالی ہیں، مولف برہان مآثر[1] نے بہمنیہ سلطنت کے ابتدائی واقعات کے بیان میں انکی منظوم تاریخ سے استفادہ کیا ہے، اسی طرح صاحب تاریخ فرشتہ[2] نے اپنی تاریخ میں دو تین مقامات پر ان کی تصنیف کا حوالہ دیا ہے، لیکن دونوں مورخوں نے نہ کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، اور نہ مصنف کے حالات پر اور نہ اپنی تاریخ کے ماخذ کی فہرست میں اس کو مقام دینا ضروری سمجھا، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایسی اہم تاریخ اور اس دور کے فارسی ادب کی ایسی بے مثال ادبی تصنیف سے قدیم تذکروں اور تاریخوں کی غفلت اور کوتاہی بڑی افسوسناک ہے، شمال کے مورخوں میں تنہا نظام الدین احمد الھروی نے اپنی تاریخ "طبقاتِ اکبری" کے ماخذ کی فہرست میں اس کا نام لیا ہے، ان حالات میں ان کی زندگی اور اخلاق و عادات کے حالات میں ہمارا تنہا ماخذ ان کی تصنیف "فتوح السلاطین" ہی ہے۔

---

[1] برہان مآثر۔ ص ۲۵ [2] فرشتہ۔ ج اول، مقالہ دوم، ص ۴۴

نام کی تحقیق "فتوح السلاطین" کے مصنف کے پورے نام سے ادبی دنیا ناواقف ہے، ان کے نام کے متعلق محققین کے بیانات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) ہرمن ایتھے[1] نے اسپرنگر[2] کے حوالے سے ان کا نام خواجہ عبدالملک عصامی نام ہونے کا امکان ان الفاظ میں اظہار کیا ہے :-

"....... is probably identical with Khwaja Abdul Malik Isami mentioned by Sprenger"

ایک اور جگہ اس طرح کہا ہے :-

"فتوح السلاطین تالیف خواجہ عبدالملک عصامی[3]"۔

ایتھے کی پیروی میں مہدی حسن[4] نے بھی ان کا نام خواجہ عبدالملک عصامی بتلایا ہے۔

(۳) عبدالغنی[5] نے مجمع التذکار کے بیان کی بنیاد پر ان کا نام عصام الدین لکھا ہے :-

---

[1] Catalogue of Persian Manuscripts in The Library of India office volume I P. (559

[2] اسپرنگر نے کتب خانۂ شاہان اودھ کی فہرست میں عماد الدین محمود الہی حسینی کے تذکرۂ شعرا "خزینۂ گنج الٰہی" کے شعرا کے نام اور تخلص کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے بیان سے مذکورۂ بالا تذکرہ کے ورق (۸) پر خواجہ عبدالملک عصامی نام کے ایک شاعر کا ذکر ملتا ہے Sprenger's Oudh Catalogue. No (11) P. 66

[3] تاریخ ادبیات فارسی۔ تالیف ہرمن ایتھے، ترجمہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق۔ صفحہ (۶۲)

[4] The Muslim culture of Medieval India by Mahdi Hasan - Islamic culture - 1950 P. 75

[5] Pre-Mughal Persian in Hindustan by A. Ghani. P. 294

[6] فتوح السلاطین: مرتبہ سید یوشع (مدراس یونیورسٹی) مطبوعہ ۱۹۴۸ء، مقدمہ صفحہ ۲

(۴) پروفیسر سید یوشع مرتب "فتوح السلاطین"[6] نے "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف شیخ عبدالملک عصامی اور ایتھے کے بیان کردہ عبدالملک عصامی کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے، اس طرح فتوح السلاطین کو ان سے متعلق کرنے کی کوشش کی ہے :-

"گذشتہ ازیں یکے دیگر بماند کہ تغیر اسم شیخ عبدالملک عصامی است کہ تاریخی موسوم بہ "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" در زبان عربی تالیف کردہ ویک نسخہ ازیں تاریخ در کتب خانہ آصفیہ محفوظ است، ممکن است کہ ہم آن خواجہ وہم ایں شیخ یکے باشد۔ بلکہ عجب نیست کہ ایں عبدالملک عصامی از اولاد آں بنی عصام باشد کہ در ملتان توطن گزیدہ"

مذکورۂ بالا بیانات سے ہم صاحب فتوح السلاطین کے نام کے بارہ میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ہیں، ایتھے نے اسپرنگر کے حوالے سے جس "خزینۂ گنج الٰہی" کا ذکر کیا ہے، وہ تذکرہ اب ناپید ہے، ورنہ اس کے دیے ہوئے نمونۂ اشعار کی مدد سے "فتوح السلاطین" کے مصنف کا نام خواجہ عبدالملک عصامی قرار دینے میں مدد مل سکتی تھی، اس سلسلے میں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سراج الدین علی خاں آرزو نے مجمع النفائس[1] میں ایک شاعر خواجہ عبدالملک عصامی کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام دیا ہے، مگر اس کو انھوں نے اکابرِ سمرقند میں شمار کیا ہے، اور امیر تیمور کے زمانہ میں شیخ الاسلام اور مقتدائے انام کے لقب سے ذکر کیا ہے، "خزینۂ گنج الٰہی" آٹھویں نویں اور دسویں صدی کے شعراء کا تذکرہ ہے، اسی طرح مجمع النفائس میں بھی آغاز سے معاصرین کا تذکرہ ہے، اس لیے اس کا قوی امکان ہے کہ "خزینۂ گنج الٰہی" کے خواجہ عبدالملک عصامی اور مجمع النفائس کے خواجہ عبدالملک عصامی دونوں ایک ہی ہوں، اسی طرح ایتھے کا یہ مفروضہ رد ہو جاتا ہے کہ "فتوح السلاطین" کا مصنف

---

[1] مجمع النفائس (سنہ تصنیف ۱۱۶۴ھ) قلمی کتابخانہ شرقی سالار جنگ ص ۳۰۸)

خواجہ عبد الملک عصامی ہے، عبد الغنی نے جس تذکرہ کا حوالہ دیا ہے اس میں اتفاقی طور پر دہلی کے ایک شاعر عصام الدین کا ذکر ہے، جس کی تصدیق فتوح السلاطین کی داخلی شہادتوں سے نہیں ہوتی، اور یہ تذکرہ بھی "خزینۂ گنج الٰہی" کی طرح ناپید ہے، ان وجوہ کی بنا پر عبد الغنی کا بیان بھی وقیع نہیں رہ جاتا۔

پروفیسر سید یہ شع نے "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف شیخ عبد الملک عصامی کو فتوح السلاطین کے مصنف ہونے کے قیاس کا اظہار کیا ہے، مذکورۂ بالا کتاب کے مصنف کا پورا نام[1] عبد الملک بن حسین بن عبد الملک تھا جس نے ۱۰۹۴ھ تا ۱۰۹۸ھ کے درمیان دنیا کی عام تاریخ لکھی، فتوح السلاطین کے مصنف کے دادا کا نام اعز الدین تھا، اور "النجوم العوالی فی ابناء الاوائل والتوالی" کے مصنف کے دادا کا نام عبد الملک تھا، دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ "فتوح السلاطین کا زمانۂ تصنیف ۷۵۱ھ ہے، اس طرح ان دونوں کتابوں کے زمانۂ تصنیف میں اس قدر بُعد پایا جاتا ہے کہ النجوم العوالی کے مصنف عبد الملک عصامی کو "فتوح السلاطین" کا مصنف قرار نہیں دیا جا سکتا،

یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں خواجہ عبد الملک عصامی نام کے دو تین اشخاص گذرے ہیں، جس کے بنا پر مورخوں کو التباس ہو گیا ہے، چنانچہ محبی[2] نے

[1] Catalogue Des Manuceripts Arabes Dela The gue Nationale Paris. P. 294 (2) A hand list of The Muhammaden manuscripts prese in The library of the U

[2] (۱) خلاصۃ الاثر ج ۳ ص ۸۰، (۲) الاعلام ج ۴ ص ۳۰۲

بھی اپنی تاریخ میں ایک عبد الملک بن جمال العصامی بن صدر الدین بن عصام الدین اسفرائنی المعروف بہ ملا عصام کا ذکر کیا ہے جو ۹۷۸ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے،

غرض عبد الملک عصامی نام کے مختلف اشخاص آٹھویں صدی سے دسویں صدی کے دوران میں گذرے ہیں، جنھوں نے اپنے علم و فضل سے اپنے زمانہ میں شہرت حاصل کی، لیکن ان میں سے کسی شخص کو بھی "فتوح السلاطین" کا مصنف قرار نہیں دیا جا سکتا، ان حالات میں ان کا نام "عصامی" ہی قرار دینا درست ہے،

تاریخ پیدائش

عصامی نے "فتوح السلاطین" میں اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق تصریح سے کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ کتاب کی بعض اندرونی شہادتوں سے ان کی تاریخ پیدائش متعین کی جا سکتی ہے۔

عصامی نے "فتوح السلاطین" کے آخری باب "مختتم این کتاب متضمن نکوہش نفس و امید داری از حضرت کردگار" کی تصنیف کے دوران میں اپنی عمر[1] چالیس سال بتلائی ہے، اور اسی کے آخر[2] میں اتمام تصنیف کا ۷۵۱ھ لکھا ہے، اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش ۷۱۱ھ مطابق ۱۳۱۰ء ہوتی ہے

خاندانی حالات

عصامی کے جد اعلیٰ "ابو عصام" عراق عرب کے باشندے اور حیرہ کے والی[3] نعمان بن منذر کے حاجب تھے، ان کی اولاد میں فخر الملک[4] عصامی ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں عباسی خلفاء کے دربار میں منصب وزارت پر مامور تھے اور تخمیناً ۶۲۰ھ میں خلیفۂ وقت کی خود رائی کے سبب سے انھوں نے وزارت سے استعفا دیدیا، اور بغداد سے مع اہل و عیال اور اہل خاندان ہندوستان کا رخ کیا، ملتان پہنچکر ان کے خاندان کے

[1] فتوح السلاطین، ص ۶۱۶ [2] ایضاً ص ۶۱۸ و [3] لسان العرب ج ۱۲ ص ۲۰۸ ہم [4] فتوح السلاطین ص ۱۲۴

بعض افراد نے پہلے وہیں طرحِ اقامت ڈالی، پھر چند دنوں کے بعد ملتان سے دہلی روانہ ہوئے، دہلی کے قریب پہنچے تو سلطانِ وقت شمس الدین التتمش نے دہلی سے چند فرسنگ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو اپنا وزیر بنا کر دہلی لایا، فخر الملک عصامی کے فرزند صدر الکرام[1] جو سلطان ناصر الدین بن ناصر الدین بن شمس الدین التتمش (۶۴۴ھ - ۶۶۵ھ مطابق ۱۲۴۱ء - ۱۲۶۶ء) کے عہد میں ظہیر الممالک کے خطاب سے سرفراز ہوئے، اور وکیل در کے منصب پر مامور ہوئے، اس خاندان نے اپنی نیک دلی اور پاک طینتی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، ان کے بیٹے[2] اعز الدین عصامی یا عز الدین عصامی ۱۲۳۷ء میں سلطانہ رضیہ کے دور میں پیدا ہوئے، اور سلطان بلبن کے عہد حکومت میں شاہی لشکر کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ یہ اعز الدین عصامی، عصامی مصنفِ فتوح السلاطین کے دادا تھے، عصامی نے اپنی تصنیف میں اپنے والد کا ذکر نہیں کیا ہے، ممکن ہے ان کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا ہو اور عصامی کی تعلیم و تربیت شفیق دادا ہی کی نگرانی میں ہوئی ہو، وہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں بہ قید حیات تھے، اس وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی، ۷۲۶ھ میں سلطان کے حکم سے وہ بھی باشندگانِ دہلی کے ہمراہ دولت آباد روانہ ہوئے، ان پر وطن اور گھر بار چھوڑنا بے حد شاق گذرا، چنانچہ دہلی سے چند میل آگے تلپت پہنچکر وطن کی یاد میں جان دیدی، عصامی مصنف فتوح السلاطین بھی اس سفر میں اپنے دادا کے ساتھ تھے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سولہ سترہ برس کی تھی، یہ اس خانماں برباد قافلہ کے ساتھ دولت آباد پہنچے اور وہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔

عصامی کے حالات زندگی | سولہ برس کی عمر سے ۴۰ برس کی عمر تک کا زمانہ (یعنی ۲۴ سال) ان کا دولت آباد میں گذرا، اس دوران میں وہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد کی بغاوتوں کا مشاہدہ

۱؎ فتوح السلاطین ص ۱۴۷، ۱۴۸ ۲؎ ایضاً ص ۴۴۸

کرتے رہے، آخر زمانے میں ان مسلسل بغاوتوں نے سلطان کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا، اس کے مظالم اور ناروا سختیاں دیکھتے دیکھتے عصامی کا دل پک گیا، وہ ہندوستان سے دل برداشتہ ہو گئے، اور ۷۵۱ھ[1] میں حرمین شریفین ہجرت کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا، ہجرت کرنے سے پہلے[2] ایک یادگار چھوڑ جانے کا خیال پیدا ہوا، اس سے قبل ان کے دو دیوان تلف ہو گئے تھے، وہ صلبی یادگار کے مقابلے میں معنوی یادگار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، اس یادگار کے لیے انھوں نے ایسا موضوع منتخب کیا جو شاعری اور تاریخ دونوں پر حاوی تھا جن سے ان کو طبعی لگاؤ تھا، اس مقصد کی تکمیل[3] کے لیے ان کو کسی بادشاہ یا امیر کی سرپرستی کی ضرورت تھی حسن اتفاق سے ایک دن قاضی بہاء الدین[4] نے انھیں بلا کر علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار میں بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ پیش کیا، غالباً اس وقت انھوں نے اپنی تصنیف کے ابتدائی لوازم یعنی حمد و نعت، مناقب خلفائے راشدین اور مدح سلطان کی پہلے ہی سے تکمیل کرلی تھی جن کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرکے خوشنودی حاصل کی اور اس کی جانب سے ہندوستان کی منظوم تاریخ کی تصنیف پر مامور ہوئے اور اس کی تکمیل کے بعد اس کا نام فتوح السلاطین[5] رکھا، یہی عصامی کی آخری تصنیف ہے جو دستبرد زمانہ سے بچ گئی، اس ادبی و تاریخی شاہکار کی تکمیل کے وقت انکی عمر چالیس سال تھی، اس کی تکمیل کے بعد قاضی بہاؤ الدین نے اس کو خان سکندر اعظم کے توسط سے بارگاہ سلطانی میں پیش کیا، اور اسکے بعد عصامی ہندوستان سے ہجرت کرکے حرمین شریفین چلے گئے اور غالباً انکا

۱؎ فتوح السلاطین ص ۲۰ ۲؎ ایضاً ص ۲۱ ۳؎ ایضاً ص ۲۲ ۴؎ قاضی بہاء الدین، سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار میں حاجب قصہ کی خدمت جلیلہ پر مامور تھے، وہ بہت نیک آدمی تھے، علم و فضل کے ساتھ نظم و نثر کا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، فتوح السلاطین ص ۲۳ ۵؎ فتوح السلاطین ص ۶۱۵

اسی مقدس سرزمین میں انتقال ہوا،

اخلاق و عادات عصامی کی سیرت ان کی تصنیف میں جھلکتی ہے، وہ بڑے ذکی الحس، زندہ القلب اور انسان دوست تھے، ان میں خود نمائی، خود پسندی اور وجاہت خاندانی کا فخر و غرور نہ تھا، اپنے اسلاف میں انھوں نے صرف فخر الملک عصامی کی تعریف کی ہے، لغت میں[1] "عصامی" کے معنی ایسا شخص ہے جس نے اپنی ذات سے بڑائی حاصل کی ہو نہ کہ اپنے آبا و اجداد کی نسبت سے، اس معنی کی تصدیق "فتوح السلاطین" کے ہر شعر سے ہوتی ہے، اس میں انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی عظمت و کمال پر کہیں فخر و مباہات کا اظہار نہیں کیا ہے، خودداری اور شرافت ان کی قیمتی متاع تھی، خانہ نشینی اور عزلت گزینی کو دوست رکھتے تھے، مال و دولت اور جاہ و مرتبہ سے بے نیاز تھے، دنیاوی ساز و سامان سے نفرت کرتے تھے، اور دولتِ فقر کو دولت دنیا پر ترجیح دیتے تھے، چنانچہ فتوح السلاطین[2] میں متعدد جگہ اپنے لیے فقر و تہیدستی کی دعا مانگی ہے، ان کا دماغ تاریخی واقعات کا خزانہ تھا، لیکن "خمار غم" کی سرگرانی ان کو دم لینے نہیں دیتی تھی،

عشق و محبت کی چاشنی کے بھی لذت آشنا تھے، جس کے اشارات ان کے اشعار میں ملتے ہیں،[3]

مرا ہست در سر فسانہ بسے　　دریں ساز دارم ترانہ بسے

مرا ہست اندر غمِ دلبرے جاں راز　　شبے ہمچو زلفش سیاہ و دراز

صاف باطن اور حق گو تھے، غرض مندی کی طرفداری اور غیر منصفانہ جانبداری سے دور رہتے تھے، سیاسی معاملات و مسائل میں آزادی اور بے باکی سے اظہار خیال کرتے تھے، اس لحاظ سے وہ دوسرے مورخوں، خاص طور سے ضیاء الدین برنی پر فوقیت رکھتے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں:-[4]

چہ داند کسے قدر ایں داستاں　　مگر آں کہ دارد رہ راستاں

[1] لسان العرب جلد ۱۲: وفی المثل: کن عصامیا ولا تکن عظامیا. ص ۴۰۶ [2] فتوح السلاطین ص ۴۴۳ و ...
[3] ایضاً ص ۲۹ [4] ایضاً ص ۲۴۸

طبیعت میں شوخی، ظرافت اور بذلہ سنجی بھی تھی جس کی شائستہ اور پاکیزہ جھلک ان کی تصنیف میں جا بجا ملتی ہے، طبیعت دولتِ دنیا سے بے نیاز تھی، اور فتوح السلاطین کی تصنیف کا مقصد فردوسی کی طرح رے کی حکومت یا دولت کا حصول نہ تھا، بلکہ اپنے وطن ہندوستان میں ایک معنوی یادگار چھوڑنا اور تاریخ کی خدمت تھی،[1]

فتوح السلاطین کا سنہ تصنیف عصامی[2] کے بیان کے مطابق کتاب کی تصنیف کا آغاز ۲۷ رمضان ۷۵۰ھ میں ہوا اور ۶ ربیع الاول ۷۵۱ھ میں اختتام کو پہنچا، اس طرح پانچ مہینے اور نو دن میں بارہ[3] ہزار اشعار کی یہ تاریخ مکمل ہوئی، اس کا موجودہ نسخہ (۱۱۵۲۴) اشعار پر مشتمل ہے، اور بقیہ (۴۷۶) اشعار کی تکمیل اس کے ایک مرتب پروفیسر سید یوشع نے کی جو ایک قابل قدر اور مستحسن کوشش ہے۔

ماخذ فتوح السلاطین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مصنف نے اس کے ماخذ نہیں بتلائے ہیں، اسی بنا پر کرنل برگس[4] نے اس کو غیر اہم کہانیوں کا مجموعہ قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے، عصامی کا دماغ تاریخی واقعات کا گنجینہ تھا، ان کے بیان[5] کے مطابق ان کی تاریخ کے ماخذ چشم دید واقعات، زبانی روایات اور وہ قصے ہیں جن کو انھوں نے عمر رسیدہ معتبر لوگوں سے سنا اور ان کی تمام روایات اور واقعات کی تحقیق اور صحت میں بڑی اور معتبر تاریخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے بعد ان کو نظم کا جامہ پہنایا،

مباحث کا اجمالی تجزیہ فتوح السلاطین ہندوستان کی منظوم تاریخ ہے، جو ۳۵۰ سال[6] کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف نے دنیا کے آغاز سے لیکر محمود غزنوی تک کے حالات سرسری بیان کیے ہیں، محمود غزنوی کے عہد سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے، اس سے پہلے انتالیس

[1] فتوح السلاطین ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۶۱۸ [3] History of The rise of Mohamadan power in India Vol I. P.406
[4] فتوح السلاطین ص ۶۱۴ - ۶۱۵ [5] ۱۰۰۰ء تا ۱۳۴۹ء

اشعار میں مسلمان سلاطین کی فتوحات کی مختصر کیفیت استفہامیہ انداز میں بیان کی ہے، ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کا ذکر بھی سرسری انداز میں کیا ہے، غالباً اس کے لیے ان کو کافی مواد نہ مل سکا، سلطان معز الدین غوری کے حملوں اور اس دور کے بعض واقعات کو نسبتہً تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ بعض مورخوں کی فروگذاشتوں کی بھی تصحیح ہوتی ہے، مثلاً انھوں نے[1] قطب الدین ایبک کا پایۂ تخت لاہور بتلایا ہے، اور دہلی سب سے[2] پہلے سلطان شمس الدین التتمش کے زمانہ میں پایۂ تخت بنا، عصامی کا یہ بیان مختلف واقعات کی بنا پر صحیح معلوم ہوتا ہے، سلطان شمس الدین التتمش اور اس کی اولاد کے دور حکومت کے واقعات نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن سے بعض نئے واقعات کا انکشاف ہوتا ہے، اور سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کی اولاد کے دور حکومت کے سلسلے میں بعض نئی اور دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، عصامی کے بیانات خلجی سلاطین کے ذکر میں عام تاریخوں پر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص طور پر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کے جو حالات اور واقعات بیان کیے ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء الدین برنی نے سلطان فیروز تغلق کی خوشامد اور تغلق خاندان کی خوبیاں نمایاں کرنے میں سلطان علاء الدین خلجی کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے، عصامی ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں سلطان علاء الدین خلجی کی بڑی تعریف کرتے ہیں[3]، خسرو خاں[4] کا غدر اور ملک غازی بیگ تغلق کی دہلی پر چڑھائی کے واقعات خسرو کے "تغلق نامہ" کی طرح مفصل تو نہیں ہیں، لیکن زیادہ تاریخی انداز میں نظم کیے گئے ہیں، غیاث الدین تغلق[5] کے نو تعمیر محل کی چھت کے گرنے کا واقعہ بھی دوسرے مورخوں کے مقابلے میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے،

۱ فتوح السلاطین ص ۱۰۳ ۲ ایضاً ص ۱۰۱ ۳ ایضاً ص ۲۷۳ ۴ ایضاً ص ۳۸۱ ۵ ایضاً ص ۴۱۸

اور اس کے بارہ میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ کیا گیا ہے، آخر میں سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے واقعات بڑی شرح و بسط سے بیان کیے ہیں، اس کی خونریزیوں اور امراء کی بغاوتوں کے ذکر کے سلسلہ میں دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کے حالات متاخر مورخین مثلاً فرشتہ اور سید علی طباطبا کے مقابلے میں زیادہ وضاحت سے بیان کیے ہیں، سلطان محمد بن تغلق نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ میں وفات پائی اور فتوح السلاطین اس کے ساڑھے دس مہینے قبل یعنی ۶ ربیع الاول ۷۵۱ھ میں تکمیل کو پہنچی،

فتوح السلاطین کی تاریخی اہمیت | فتوح السلاطین اپنے عام انداز کے اعتبار سے شاہنامہ کا جواب بھی ہے اور اس کا ضمیمہ بھی، فردوسی نے شاہنامہ میں حضرت آدمؑ سے لیکر محمود غزنوی کے عہد تک ایران قدیم اور اسلامی دور کے بادشاہوں کا ذکر کیا ہے، اور عصامی نے ایران باستان کے ان قومی کرداروں کا ذکر دیباچہ میں مختصر طور پر کیا ہے اور محمود غزنوی سے کتاب کی تصنیف کے زمانے تک کے تمام واقعات اور سلاطین کی فتوحات کو سنہ وار شاہنامہ کی بحر میں نظم کیا ہے، غنی[1] نے اس خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے،

"یہ تصنیف اپنی کیفیت اور عمومی تاریخی پہلو کے لحاظ سے فردوسی کی شاہنامہ سے مشابہ ہے"

عصامی کو تاریخ نگاری سے طبعی لگاؤ تھا، اس لیے فتوح السلاطین شمال کی تاریخ کے ساتھ ابتدائی بہمنی دور کی تاریخ کا اچھا مرقع ہے، اسی بنا پر اس کو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا شاہنامہ[2] قرار دیا جاتا ہے، بہمنی عہد کی تاریخوں میں صرف یہی ایک تاریخ دستبرد زمانہ کا شکار ہونے سے بچ گئی، اس طرح اس کتاب کی معاصرانہ اہمیت بھی ہے، فتوح السلاطین بہمنیہ سلطنت

۱ Pre Mughal Persian in Hendustan P. 284. ۲ فتوح السلاطین: مرتبہ آغا مہدی حسن، مطبوعہ ۱۹۳۸ء، آگرہ، دیباچہ، صفحہ ۱

ابتدائی دور کا اہم اور مستند ترین ماخذ ہے، عصامی ان تمام عوامل اور حالات سے بخوبی واقف تھے، جو دکن میں رونما ہو رہے تھے، اور جو ایک خود مختار سلطنت کی تاسیس پر ختم ہوئے، حسن اور اس کے ساتھی امیران صدہ نے سلطان محمد بن تغلق کی سختی اور جبر و تشدد سے تنگ آکر دکن میں مرکز کے علی الرغم ایک آزاد سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، عصامی کے تاریخی شعور کی صورت گری میں اس واقعہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اور اس کتاب سے دکن میں ایک آزاد حکومت کے قیام کے متعلق اہم مواد فراہم ہوتا ہے، اس بنا پر فتوح السلاطین ہندوستان کی تاریخی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے،

عصامی نے اس تاریخ میں واقعہ نگاری کا جوہر بھی دکھلایا ہے، کہیں کہیں مبالغہ اور رنگین بیانی سے بھی کام لیا ہے، لیکن دروغ گوئی کو جگہ نہیں دی ہے، اور قادر الکلامی اور شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے عصامی کو بجا طور پر "فردوسی ہند" قرار دیا جا سکتا ہے، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے تاریخ نگاروں میں حسن نظامی مصنف تاج المآثر (۶۱۴ھ) اور منہاج السراج صاحب طبقات ناصری (۶۵۸ھ) ان کے حریف مقابل ہیں، مگر فتوح السلاطین کو صوری اور معنوی محاسن کے اعتبار سے ان دونوں تاریخوں پر ترجیح حاصل ہے، اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر بہمنیہ دور کے آخر میں آذری اسفرائینی کو خاندان بہمنیہ کی منظوم تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، جس نے "بہمن نامہ" کا قالب اختیار کیا، لیکن یہ فن اور شاعری کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں ثانوی درجہ رکھتا ہے،

عصامی تغلق عہد کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی کے ہم عصر تھے، تاریخ فیروز شاہی فتوح السلاطین کی تصنیف کے سات یا آٹھ سال بعد لکھی گئی، گو فتوح السلاطین، تاریخ فیروز شاہی کے مقابلے میں مبسوط نہیں ہے، لیکن تاریخی واقعات کے خلاء کو پُر کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے، چودھویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات اور نفسیاتی مزاج کو عصامی نے ایک

نئے انداز میں پیش کیا ہے، جس سے اس عہد کے روح کی ترجمانی ہوتی ہے، جیسا کہ ایک مبصر کا خیال ہے

"وہ اپنے عہد کی تصویر کشی کوشش کے بغیر پیش کرتا رہتا ہے، اس کے قصوں، مکالموں اور مشاہدوں میں ایسی فضا ہے جس میں اس عہد کی روح پائی جاتی ہے۔" [1]

اس میں شبہ نہیں کہ ضیاء الدین برنی ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے نامور مورخ ہیں لیکن ان کی تاریخ خامیوں سے خالی نہیں ہے، اس میں عصبیت اور تنگ نظری پائی جاتی ہے، انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضعیف العمری میں لکھی جب انسان کا حافظہ جواب دینے لگتا ہے، اس لیے ان کی تاریخ میں ترتیب اور تنظیم کے بجائے انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کو سلطان محمد تغلق کی شخصیت کے پہچاننے میں بھی ناکامی ہوئی، حالانکہ ایک طویل مدت تک اس کو سلطان کا ندیم رہنے کا شرف حاصل تھا، اس کی تاریخ سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی (۶۶۴ھ) سے شروع ہوتی ہے، اور سلطان فیروز تغلق کے چھٹے سال جلوس (۷۵۸ھ) کے واقعات پر ختم ہوتی ہے، تاریخی واقعات کے اعتبار سے بھی فتوح السلاطین کا افق تاریخ فیروز شاہی کے مقابلے میں وسیع ہے، عصامی کو تاریخی واقعات کے احاطہ اور اس کے تجزیہ میں غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس میں حکمرانوں کے طرز حکومت کے علاوہ اس دور کے علمی اور مذہبی حالات بھی جستہ جستہ ملتے ہیں، چنانچہ کہیں دہلی کی آبادی اور وہاں کے علماء اور فضلا کا ذکر ہے، کہیں تمدنی اور معاشرتی حالات کی جھلک ہے،

ان محاسن کے ساتھ فتوح السلاطین میں کچھ خامیاں اور فنی معائب بھی پائے جاتے ہیں، مگر ایسی خامیوں سے ہندوستان اور یورپ کے عہد وسطیٰ کی تاریخیں بھی خالی نہیں ہیں، عہد وسطیٰ کے مورخین بیشتر شاہی دربار سے وابستہ تھے، اور وہ واقعات کو اپنے مربیوں

---

[1] The rise of muslim power in Gujrat P. 7

کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ بسا اوقات ان جنگوں کو جو ملک گیری اور توسیع مملکت کے لیے ہوتی تھیں، جہاد کا نام دیتے تھے، اسی جذبۂ مذہبی کی بنا پر عصامی نے بھی فتوح السلاطین کو "مرغانِ توحید" کا تذکرہ کہا ہے، اور شاہنامہ کو بدمذہبوں کی تاریخ قرار دیا ہے،

ان مورخین کے انداز بیان میں روایتی اسلوب کی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، وہ تاریخ کو اپنے نقطۂ نظر کے تابع بنا لیتے ہیں، اور واقعات کے بیان میں شاعرانہ خیال آرائی سے کام لیتے ہیں، جیسا کہ فلپس نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:-

"Since Hasan Nizami, Amir Khusrow and Isami subardinate history to art and treat the past as raw material for their poetic imagination."[1]

اس سے تاریخ کی حقیقت نگاری متاثر ہو جاتی ہے، عصامی نے بھی اپنی تاریخ کو سلاطین اور امراء کے جاہ و جلال اور اقتدار کا تماشا گاہ بنایا ہے، لیکن عصامی کا ذوق اخلاقی اور حکیمانہ ہے، اس کا اثر فتوح السلاطین میں نمایاں ہے[2]، چنانچہ اس میں ایسے بادشاہوں اور امیروں کو بلند مقام حاصل ہے جو اخلاقی اوصاف سے آراستہ تھے، اسی ذوق کی بنا پر وہ ہر اہم تاریخی واقعہ (بادشاہوں کی تخت نشینی، وفات اور لڑائیوں) کے بعد ناظرین کو اخلاقی تعلیم دیتے ہیں، جس سے ان کے اخلاقی رجحان کا پتہ چلتا ہے،

---

[1] Historians of India, Pakistan & Ceylon Phi lipsd (School of Greental & African Studies)-1961. P.124

[2] فتوح السلاطین، ص ۱۰۰ ... ایضاً ص ۲۲۴ - ۲۴۸ - ۲۹۹ - ۳۹۱

بعض اوقات وہ اصل واقعات کو ضمنی اور ذیلی واقعات سے اس لیے ملا دیتے ہیں کہ ان سے اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے، ان کے نزدیک تاریخ کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگ پچھلے واقعات سے سبق حاصل کیا کریں، اور آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جائیں، ایک مبصر نے[1] اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"Episodes are inter spread with an ecdotes and moralizing on the dangers of worldly vanity."

بحیثیت مجموعی عہد وسطیٰ کی تمام تاریخوں کا خواہ ہندوستان کی ہوں یا یورپ کی لب و لہجہ مذہبی ہے، اس سے فتوح السلاطین بھی مستثنیٰ نہیں ہے،

فتوح السلاطین سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر مفید روشنی پڑتی ہے، ذیل میں چند واقعات اجمالی طور پر بیان کیے جاتے ہیں، ان سے ان کی تاریخی قدر و قیمت کے تعین میں مدد ملتی ہے:-

(۱) عہد وسطیٰ کے مورخین میں عصامی پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے ان حالات پر روشنی ڈالی ہے، جن کے تحت غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا، منہاج السراج کی حیثیت معاصر مورخ کی ہے، لیکن ان کی تاریخ طبقات ناصری میں ۶۵۸ھ تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوا، اگر وہ اپنی تاریخ بلبن کی تخت نشینی پر بھی ختم کرتے تو ایسے واقعات کے بیان کرنے سے احتراز کرتے جن سے ان کے مربی الغ خاں اعظم (سلطان غیاث الدین بلبن) کی شہرت اور نیک نامی کو نقصان پہنچتا، دوسرا مورخ ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ بلبن کی

---

[1] History of India; Pakistan and Ceylon. P. 124.

تخت نشینی (۶۶۲ھ) سے شروع کرتا ہے، اس طرح ان دونوں کے بیانات میں چھ سال کا وقفہ ہوجاتا ہے، عصامی ہی وہ مورخ ہیں جنھوں نے اس تاریخی خلا کو پر کیا ہے، اور اس درمیانی وقفہ کے اہم واقعات لکھے ہیں[1]، اور قطعیت کے ساتھ بلبن کو سلطان ناصر الدین محمود کو زہر دے کر ختم کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے، عصامی کے اس بیان کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے:

"ثم ان نائبه غیاث الدین بلبن قتله وملک بعده"[2]

بعض مورخین نے اس بیان کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے لیکن عصامی اور ابن بطوطہ کے بیان کو رد کرنے سے پہلے چند حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، عصامی کا تعلق سلاطین دہلی سے زمانۂ قدیم سے تھا، اور ان کے اسلاف دربار میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے، اس لیے ان کے بیانات کا ماخذ ان کے بزرگ ہیں، دوسرے اس قضیہ میں بلبن کی ابتدائی زندگی اور کردار سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے، بلبن، سلطان شمس الدین التمش کا ایک ترک غلام زادہ تھا، جس کو بخارا میں ایک فقیر نے خراب و خستہ حالت میں دیکھ کر بادشاہت کی پیشین گوئی کی تھی[3]، اس طرح ابتدا ہی سے بادشاہت کا خیال اس کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔

(۲) معاصرت کی بنا پر محمد بن تغلق کے دور حکومت کے واقعات میں فتوح السلاطین کا بیان زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے، اور اہل ملک پر اس حکومت کے اثرات، چودھویں صدی کے عام نفسیاتی مزاج اور سیاسی رجحانات پر اس کتاب سے اچھی روشنی پڑتی ہے، مہدی حسن[4] اس کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[1] فتوح السلاطین، ص ۱۶۳ [2] رحلہ - ۲ ص ۲۶ [3] ایضاً ج ۲ صفحہ ۲۷

[4] Critical study of the sources for the history of India - Islamic cultur - 1957. P. 317

"حقیقت فتوح السلاطین کی دریافت سے محمد بن تغلق کی تاریخ کی تحقیقات کی دولت میں اضافہ ہوا ہے"

سلطان محمد بن تغلق کی شخصیت اور بادشاہت کے متعلق صحیح اور متوازن نقطۂ نگاہ قائم کرنے کے لیے فتوح السلاطین، رحلۂ ابن بطوطہ اور تاریخ فیروز شاہی کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے، اس کی تصدیق واقعات ذیل سے ہوتی ہے،

(الف) سلطان غیاث الدین تغلق نے تخت نشینی کے بعد شہزادہ جونا خاں (سلطان محمد بن تغلق) کو ورنگل کی مہم پر ۷۳۱ھ میں روانہ کیا، پہلی دفعہ شاہی فوج کو شکست اٹھانی پڑی، اس شکست کے اسباب میں ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی اور عصامی کے بیانات مختلف ہیں، ضیاء الدین برنی[1] نے رسل و رسائل کے سامان ختم اور غیاث الدین کی موت کی غلط خبر مشہور ہوجانے کو شکست کا سبب قرار دیا ہے، ابن بطوطہ[2] کا بیان ہے کہ شہزادہ جونا خاں نے ملا عبید کو اپنے باپ کے انتقال کی غلط خبر مشتہر کرنے کے لیے آمادہ کیا تاکہ اس کی بادشاہت کے لیے راستہ ہموار ہوجائے، ان دو معاصر مورخوں کے بیانات کا مطالعہ فتوح السلاطین کی روشنی میں کرنے سے اصل حقیقت بے نقاب اور عصامی کی حق پسندی اور مورخانہ دیانت ظاہر ہوجاتی ہے[3]، عصامی[5] نے ورنگل کی مہم کی ناکامی کا سبب ملا عبید کی دخل اندازی کی بنا پر فوجی سرداروں تگین اور تمر کی شہزادے سے بغاوت اور دیو داسے (ورنگل کا راجہ) سے سازش کو قرار دیا ہے،

(ب) سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بارہ میں ضیاء الدین برنی ابن بطوطہ اور عصامی کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے، سلطان غیاث الدین تغلق بنگال کی مہم سے کامیاب واپسی پر شہزادہ جونا خاں نے تغلق آباد (دہلی) سے پانچ میل کے فاصلے پر (یعنی افغان پور)

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۴۷ - ۴۴۸ [2] رحلہ ج ۲ ص ۳۸ [5] فتوح السلاطین ص ۳۱۲

لکڑی کا ایک شاندار محل باپ کے استقبال کے لیے تعمیر کرایا، ضیاء الدین برنی[1] کے بیان کے مطابق محل پر بجلی گرنے سے سلطان غیاث الدین تغلق مع پانچ چھ آدمیوں کے چھت کے نیچے دب کر مر گیا، ابن بطوطہ[2] نے سلطان کی موت کو شہزادہ اور ملک احمد بن ایاز کی سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے، عصامی[3] نے ابن بطوطہ کے بیان کو ایک بوڑھے شخص کا قیاس قرار دیکر اپنی مورخانہ دیانت اور غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔

(ج) فتوح السلاطین کے بیانات سے سلطان محمد بن تغلق سے ابن بطوطہ کے عناد کی وجہ سمجھ میں آتی ہے، سلطان دوسرے مذاہب کے علماء کی زیادہ سرپرستی کرتا تھا، خاص طور پر ایسے علماء جو یونانی علم کلام یا فلسفہ میں درک رکھتے تھے، وہ مسلمان علماء کی خونریزی کو مباح سمجھتا تھا، اسی بنا پر پایۂ تخت کے قاضیوں نے اس کے قتل کی منظوری دیدی تھی، فتوح السلاطین کی دریافت سے ابن بطوطہ کے سلطان پر عائد کردہ الزامات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بہاء الدین گرشاسپ حاکم ساگر کی عبرت ناک سزا کے متعلق ابن بطوطہ[4] نے مبالغہ آرائی سے کام لیا، اسکے بیان کے مطابق اس کو قتل کر دینے کے بعد اس کے جسم کو چاول میں پکا کر اس کے بیوی بچوں کے پاس بھیجا گیا اور اس کے جسم کی کھال میں بھس بھر وا کر دوسرے امراء کی عبرت کی خاطر تمام صوبوں میں گشت کروایا، فتوح السلاطین[5] میں گرشاسپ کی سزا کے تعلق سے صرف دوسرے حصے کا ذکر پایا جاتا ہے اسی طرح ابن بطوطہ[6] نے دہلی سے دولت آباد کو آبادی کے تخلیہ کے موقع پر ایک اندھے اور لنگڑے کی اذیت ناک سزا کا ذکر کیا ہے۔ فتوح السلاطین[7] میں بھی باشندگان دہلی کی دولت آباد منتقلی کی دردناک داستان بیان کی گئی لیکن اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ عصامی خود اس ہجرت کرنے والے کاروان کے ساتھ تھے، اور ترک وطن کے صدمے سے ان کے دادا

1 تاریخ فیروز شاہی ص ۴۵۲ 2 رحلہ ج ۲ ص ۴۰ 3 فتوح السلاطین ص ۴۲۰ 4 رحلہ ج ۲ ص ۶۳
5 فتوح السلاطین ص ۴۳۱ 6 رحلہ ج ۲ ص ۱۷ 7 فتوح السلاطین ۴۴۶ - ۴۵۳

جاں بر نہ ہو سکے، اس سانحہ کے باوجود عصامی نے اپنی طبعی شرافت اور حق پسندی کی بنا پر سلطان کے کردار کو ابن بطوطہ کے مقابلے میں نسبتاً ہلکے رنگ میں پیش کیا ہے۔

(د) فتوح السلاطین کے بیانات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کی کردار کشی کے بارہ میں ان کے بیانات ذاتی بغض و عناد کا نتیجہ ہیں، چنانچہ مہدی حسن[1] لکھتے ہیں:-

"I can not concur with the views exmpressad in the Isami-Nama about Isami's portraiture of Mohammad bin Tgluq."

پروفیسر ہارون خاں شروانی[2] نے بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے:-

"...... is on the whole reliable except in regard to the character of Mohammad bin Tugluq".

اس میں کچھ شک نہیں سلطان محمد بن تغلق کے کردار کے بیان میں طنز اور ندامت کا پہلو نمایاں ہے، عصامی نے سلطان کو ظالم، دون پرست، نا ہمایوں سیر، مخرب سیر اور ضحاک کے القاب سے یاد کیا ہے،[3] اور سلطان غیاث الدین تغلق کی موت پر اس کے رنج و غم کو مصنوعی قرار دیا ہے۔ دہلی میں ایک ضیافت کے موقع پر دعایا کو سلطان نے جو نصیحت کی ہے، اس کے بیان[4] میں بھی طنز کا زہر ہے، عصامی کے ان بیانات میں ان کے طبعی میلان اور ذاتی واقعات کو بڑا دخل ہے، عصامی پر مذہبی رنگ غالب تھا، سلطان[5] نے پایۂ تخت کے قاضیوں

1 فتوح السلاطین: مرتبہ آغا مہدی حسین۔ انگریزی مقدمہ 2 The Bahmani's of the Deccan.... P. 34 3 فتوح السلاطین ص ۴۲۱ 4 ایضاً ص ۴۲۳ 5 ایضاً ص ۵۱۵

ان کے اختیارات سلب کر لیے تھے، وہ مسلمان علماء کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کے علما کی بڑی قدر کرتا تھا، اسلامی قوانین سے سلطان کا انحراف، غیر مسلموں کی دلداری اور ان کے تہواروں میں شرکت عصامی کو ناپسند تھی، اس لیے وہ اس کی مذمت کرتا تھا، دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ دہلی کے تخلیہ آبادی سے لیکر دولت آباد میں قیام اور دکن میں ایک آزاد حکومت کی تشکیل تک تمام حالات کے عینی شاہد تھے، عصامی کا خاندان بھی سلطان کی نارو اسختی کا شکار تھا، چنانچہ دہلی سے دولت آباد کے سفر کی پہلی منزل میں انکے دادا کا سایۂ عاطفت انکے سر سے اٹھ گیا، اس سانحہ نے انکے حساس دل پر گہرا اثر کیا، اسکے بعد اپنے قیام دولت آباد کے زمانے میں باغی امرا کے ساتھ سلطان کی نارو اسختیاں دیکھتے رہے، فتوح السلاطین[1] کے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دولت آباد میں ان کے قیام کا زمانہ سخت مصائب میں گذرا، اس ہنگامۂ دار و گیر میں انکے دو دیوان تلف ہوگئے، سلطان محمد بن تغلق کی کردار کشی کے وقت یہ تمام واقعات انکے تحت الشعور میں موجود تھے جنھوں نے سلطان کے متعلق ان کے خیالات پر اثر ڈالا، ان سب باتوں کے باوجود عصامی نے اپنے معاصر سیاح ابن بطوطہ کے مقابلے میں سلطان کے کردار کو ہلکے رنگ میں پیش کیا ہے، عصامی کے دوسرے ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی کے بیانات سلطان محمد بن تغلق کے متعلق زیادہ بھروسہ کے قابل نہیں ہیں، ان دونوں معاصرین کے مقابلے میں عصامی نے ایک حد تک متوازن نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے، ان حالات میں فتوح السلاطین کے بیانات کو مصنف کے ذاتی بغض و عناد پر محمول کرکے بالکلیہ رد کر دینا عصامی کے ساتھ انصاف نہیں ہے، بعض جگہ بیانات میں لہجہ کی تلخی اور طنز کی نشتریت میں ان کے ذاتی حالات اور مصائب کو بھی دخل ہے، بحیثیت مجموعی عصامی چودھویں صدی کا واحد مورخ ہے، جس نے سلطان محمد بن تغلق کے خوف اور مہربانی سے بلند ہوکر اس عہد کی تاریخ لکھی۔

(باقی)

---

[1] فتوح السلاطین، ص ۱۲ - ۱۳

ابوالفرج الاصبہانی

اور

کتاب الاغانی

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب ایم اے لاہور

ابوالفرج الاصبہانی چوتھی صدی ہجری کے مشہور امام ادب اور عربی زبان کے بے مثل نثر نگار ہیں، ان کی زندہ جاوید کتاب کتاب الاغانی ایک ہزار برس سے ہر زمانہ کے ادیبوں اور انشاء پردازوں کی مونس و ہمدم چلی آرہی ہے،

ابتدائی حالات ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: علی بن الحسین بن محمد بن الہیثم بن عبد الرحمان ابن مروان بن عبد اللہ بن مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف ۲۸۴ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے، لیکن بچپن میں بغداد چلے آئے اور یہیں پرورش پائی، ان کے والد اور چچا دونوں صاحب علم و فضل اور موسیقی و غنا کے دلدادہ تھے، اسوقت بغداد متمدن دنیا کا مرکز اور خلافت عباسیہ کا مستقر تھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے:-

"جلالت قدر اور عظمت و شان کے لحاظ سے بغداد کی دنیا میں نظیر نہ تھی، علماء، ادباء، صلحاء کا شمار نہ تھا، خانقاہیں اور سرائیں لاتعداد تھیں، ملک میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا، ہوا معتدل تھی، سبزے اور پانی کی فراوانی تھی، ہارون الرشید کے زمانے میں شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔" (تاریخ بغداد خطیب بغدادی ج ۱ ص ۱۱۹)

ابوالفرج الاصبہانی جب بغداد پہنچے تو علماء کی مجالسِ درس طلباء سے معمور اور صوفیا کی خانقاہیں ذکر و فکر سے آباد تھیں، اس کے باشندے خوش حال، خوش اطوار اور خوش پوش، امراء، وزرا علوم و فنون کے مربی اور سرپرست تھے، جن کے دامن سے بیسیوں شاعر، ادیب اور صاحب علم وابستہ رہتے تھے۔

اساتذہ ابوالفرج کے زمانے میں یوں تو بہت سے علماء صاحبِ درس و تدریس تھے، ان میں چار کا طوطی بول رہا تھا، یہ ابوبکر بن درید، ابوبکر بن الانباری، علی بن سلیمان الاخفش اور ابراہیم بن محمد بن عرفہ نفطویہ تھے، ابوبکر محمد بن الحسن بن درید الازدی اپنے زمانے میں لغت، ادب، شعر اور انساب کے امام اور خوش فکر شاعر تھے، نحو اور ادب کا درس دیتے تھے، نوّے (۹۰) سال کی عمر میں وفات پائی، موسیقی اور غنا سے بھی شغف رکھتے تھے، جمہرۃ فی اللغۃ اور الاشتقاق ان کی مشہور کتابیں ہیں، شراب کی تعریف میں ان کے یہ آبدار شعر ہیں:-

حمراء قبل المزج صفراء بعدہ	اتت بین ثوبی نرجس و شقائق
حکت وجہ المعشوق صرفا فسلطوا	علیہا مزاجا فاکتست لون عاشق

خالص شراب سرخ ہوتی ہے اور آمیزش کے بعد زرد نظر آتی ہے، گویا وہ نرگس اور شقائق کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔

خالص ہونے کی صورت میں وہ معشوق کے رخسار جیسی نظر آتی ہے اور آمیزش کے بعد عاشق امرد کا رنگ (زرد) اختیار کر لیتی ہے۔[1]

(۲) ابوبکر بن الانباری۔ تاریخ، اشعار، انساب کے ماہر، حدیث کے عالم اور شعر و شاعری اور علم لغت میں بلند پایہ رکھتے تھے، عمر بھر بصرہ کے قاضی رہے، حدیث اور لغت کا سبق

۱؎ بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۷۰۹ - ۷۱۳

یکساں مہارت سے دیتے تھے، ۳۰۵ھ میں وفات پائی۔[1]

(۳) علی بن سلیمان الاخفش۔ ان کا افاضل علمائے عربیت میں شمار ہے، ۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔[2]

(۴) ابوعبداللہ ابراہیم بن محمد بن عرفہ المعروف بہ نفطویہ عربیت، لغت اور حدیث کے عالم، قرآن پاک، سیرت، ایام عرب، تاریخ اور وفیات کے حافظ تھے، بغداد میں نحو اور ادب کا درس دیتے تھے، پرہیزگار اور پاکدامن تھے، ان کی مجالس پاکیزگی، صفائی اور خوش اخلاقی کا نمونہ تھیں، ۳۲۳ھ میں بغداد میں وفات پائی۔[3]

ابوالفرج نے ان ائمۂ اعلام سے اکتساب علم کیا اور ان کے فیضِ تربیت سے حدیث، اشعار، لغت اور نحو میں اتنا کمال حاصل کیا، کہ ان علوم کے استادوں میں ان کا شمار ہونے لگا، وہ بے حد ذہین و فطین تھے، ہزاروں اشعار ازبر تھے، اخبار عرب، ایام عرب اور انساب عرب کے حافظ تھے، ان علوم کے علاوہ علم الجوارح، بیطاری، طب اور نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، ادب اور انشاء کے تو امام تھے، ان کی عبقریت اور مہارت انشاء پردازی پر کتاب الاغانی شاہد ناطق ہے، جو ایک ہزار برس سے تمام ادیبوں اور انشاء پردازوں کے لیے ادبی سرچشمہ رہی ہے، ابوالفرج شیریں مقال اور ظریف الطبع بھی تھے، باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، علم مجلسی کے ماہر تھے، ان کے علم و فضل، گفتگو اور شیریں بیانی کی وجہ سے امراء اور وزراء انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے اور انکی صحبت اور مجالست کے جویا رہتے۔

ابوالفرج کے قدردان اور مربی ابوالفرج کے پہلے مربی اور قدردان بنو حمدان تھے، جن کی

۱؎ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۷۴ ۲؎ معجم الادباء، یاقوت ج ۵ ص ۲۲۰ - ۲۲۵ ۳؎ ایضاً ج ۱ ص ۳۰۷ - ۳۱۵

نسبت امام ابو منصور الثعالبی رقم طراز ہیں :-

" بنو حمدان ملوک اور وزراء تھے، ان کی خوبروئی، طلاقت لسانی، سخاوت اور عقل و دانش کا دور دور تک شہرہ تھا، سیف الدولہ اس خانوادے کا گل سر سبد تھا، جو ادباء اور شعراء کا ملجا و ماوی اور سائلوں کا کعبۂ مقصود تھا۔"[1]

۳۳۴ھ میں معز الدولہ کی سرکردگی میں آل بویہ نے بغداد پر قبضہ کرلیا، اور بنو حمدان کو جیل سے نکال کر عراق عرب اور عراق عجم پر قبضہ کرلیا، عباسی خلیفہ المستکفی باللہ برائے نام خلیفہ تھا، اصل طاقت معز الدولہ کے ہاتھوں میں تھی، گورنروں اور دوسرے عہدہ داروں کا عزل و نصب بھی اسی کے اختیار میں تھا، بنی بویہ شیعہ تھے، اس لیے ان کے عہد میں شیعیت کو بڑا فروغ ہوا، معز الدولہ کا وزیر ابو محمد المہلبی علماء اور ادباء کا بڑا قدر دان تھا، اس لیے بنو حمدان کے زوال کے بعد ابو الفرج بھی وزیر ابو محمد المہلبی کی سرکار سے متعلق اور تاحیات ندیم رہے، ابو محمد المہلبی کی نظافت طبع کے سلسلہ میں یاقوت نے لکھا ہے کہ وہ کھانے پینے میں نہایت نفاست پسند تھے، جب وہ چاول یا کھیر وغیرہ کھاتے تو ہر لقمہ کے لیے نیا چمچہ استعمال کرتے، ایک غلام ان کے دائیں جانب تیس کے قریب بلوری چمچے لیے کھڑا رہتا، چمچے لے کر چاول کھاتے اور بائیں جانب کے دوسرے غلام کو دیتے جاتے، ایک ہی چمچے کو بار بار منہ میں نہیں ڈالتے تھے۔[2]

ابو الفرج کی عادات و اخلاق ابو الفرج دوستوں کے دوست اور یاروں کے ہمدرد و غمخوار تھے، اپنے اساتذہ کی بے حد عزت و تکریم کرتے تھے، فارغ البالی اور دولتمندی کے باوجود انھیں زیب و زینت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، معمولی کپڑے پہنتے تھے، اور کئی کئی دن

[1] یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۸ طبع بیروت [2] یاقوت معجم الادباء ج ۳ ص ۱۹۰

ایک ہی کپڑے پہنے رہتے، کھانے پینے کے بڑے شائق اور پُر خور تھے، کھانے کے بعد ہاضمہ کیلیے پسی ہوئی کالی مرچیں پھانکتے تھے، ان خامیوں کے باوجود ان کے امراء اور وزراء ان کو عزیز رکھتے،

شاعری ابو الفرج شاعر بھی تھے، لیکن ہجو گو تھے، ان کا ایک مرغ مر گیا تھا، اس کا مرثیہ لکھا ہے، ایک نظم میں وزیر المہلبی سے گھر میں چوہوں کی کثرت کی شکایت کی ہے،

مذہب مورخین نے ان کو بالاتفاق شیعہ لکھا ہے، لیکن استاد شفیق جبری استاد ادب جامعۂ دمشق نے کتاب الاغانی کی اندرونی شہادتوں سے اس کی تردید کی ہے[1]، ان کی تحقیق میں کتاب الاغانی میں بنو امیہ خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ، ولید بن یزید، اور ہشام وغیرہ کے حلم، مکارم اخلاق اور جود و سخا کے متعلق بہت سی روایات ہیں، جن کو کوئی شیعہ مصنف نہیں لکھ سکتا، مشہور شیعہ شاعر دعبل کے متعلق ابو الفرج نے لکھا ہے کہ وہ بدزبان اور دریدہ دہن تھا، دوسرے شاعر السید الحمیری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ گندے کپڑے پہنا کرتا تھا، اور اس کی نعلوں سے بو آیا کرتی تھی، اس لیے کوئی شخص اس کو اپنے پاس نہ بٹھاتا تھا، کوئی شیعہ مصنف ان شاعروں کے متعلق اس قسم کی روایات نہیں بیان کرسکتا، ان روایات میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ ابو الفرج محب اہل بیت تھے جس پر انکی کتاب مقاتل الطالبین جو شہدائے اہل بیت کے حالات میں ہے، شاہد عدل ہے،

وفات ان کے سنہ وفات میں مورخوں کا بیان مختلف ہے، تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) تاریخ ابن خلکان اور معجم الادباء (یاقوت) میں ان کا سنہ وفات ۳۵۶ھ مرقوم ہے اور یہی صحیح ہے[2]

[1] دراستہ الاغانی ص ۴۸ ، ۳۷ [2] تاریخ بغداد اور معجم الادباء۔ یاقوت

تلامذہ | ابو الفرج کے شاگردوں میں لغت، ادب اور حدیث کے بہت سے ائمہ پیدا ہوئے، ان میں امام دارقطنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام دارقطنی اپنے زمانہ کے علوم حدیث کے امام، فقہ میں اختلاف فقہا کے بڑے عالم تھے، علوم قرآن کے ماہر اور دواوین عرب کے حافظ تھے، کتاب السنن اور المختلف والموتلف وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں، ۳۸۵ھ میں اس دار فنا سے دار بقا کی طرف کوچ کیا، ان کے علاوہ ابو زکریا الاندلسی، ابو الحسین علی بن محمد اور ابراہیم بن مخلد الباقری کا شمار بھی ان کے تلامذہ میں سے ہے[1]۔

تصانیف | ابن الندیم نے الفہرست میں ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کی نشاندہی کی ہے، کتاب الاغانی الکبیر (اس کتاب پر ہم مفصل تبصرہ کریں گے)، کتاب مجرد الاغانی، کتاب مقاتل آل ابی طالب (ایران اور مصر میں چھپ گئی ہے)۔ کتاب تفضیل ذی الحجم، کتاب الاخبار والنوادر، کتاب ادب السماع۔ کتاب الاخبار الطفیلیین، کتاب ادب الغربا من اہل الفضل والاداب، کتاب مجموع الآثار والاخبار، کتاب الخمارین والخمارات، کتاب الدیارات، کتاب صفۃ ہارون، کتاب الفرق والمعیار[2]۔

کتاب الاغانی | کتاب الاغانی ابو الفرج الاصبہانی کی پچاس سالہ محنت کا نچوڑ اور ثمرہ ہے، اس کتاب کی بنیاد ان سو سروں پر ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کے لیے منتخب کیے گئے تھے، اور جن پر الواثق کے لیے اضافہ کیا گیا، اغانی میں ان راگوں کے موجد اور گانے والوں کے حالات بھی لکھے ہیں، اور ان وقائع کا بھی ذکر ہے، جن میں یہ راگ گائے گئے تھے، اسی طرح کتاب الاغانی اخبار عرب، ایام عرب، انساب عرب کا خزینہ، اشعار عرب کا سفینہ، مشہور مغنیوں اور ارباب نشاط کا تذکرہ اور ملوک جاہلیت اور خلفائے اسلام کے قصص و

[1] تاریخ بغداد و معجم الادبا، یاقوت [2] کتاب الفہرست، ابن الندیم ص ۱۱۵ طبع یورپ

حکایات کا دلآویز ذخیرہ ہے، اس زمانہ کے عوام کس طرح زندگی گذارتے تھے، کیا کھاتے تھے اور کیا پہنتے تھے، شادی اور غمی کی تقریبات کس طرح منائی جاتی تھیں، بے تکلف دوست واحباب سیر و تفریح کے مقامات سے کیسے لطف اندوز ہوتے تھے، امرا اور وزرا کی محافل ادب میں کن علوم کا تذکرہ ہوتا تھا، اس قبیل کی تمام چیزوں کی تفصیل اس جلیل القدر کتاب میں ملتی ہے، گویا یہ کتاب عربوں کی حیات اجتماعیہ کا دلکش مرقع ہے، جس میں قوم کے مختلف طبقات اپنی اپنی خصوصیتوں کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں[1]۔

ابو الفرج الاصبہانی نے کتاب الاغانی کی تالیف کی غرض و غایت کتاب کے مقدمہ میں یہ بیان کی ہے:-

"یہ کتاب علی بن الحسین بن محمد القرشی المعروف بہ کاتب الاصبہانی کی تالیف ہے، اس میں امکان بھر قدیم و جدید عربی غنا و موسیقی کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ہر شعر کو اس کے کہنے والے اس کے راگ، مغنی اور اس کے طریقۂ غنا کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، مشکل الفاظ کی تشریح اور وجوہ اعراب سے بحث کی گئی ہے[2]"۔

ابو الفرج نے کتاب الاغانی کی تالیف میں محدثین کے مسلک کا طریقہ اختیار کیا ہے اور ہر واقعہ کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے، اور اس کی پوری سند تحریر کر دی ہے، اور اس کا ماخذ بھی لکھ دیا ہے، جا بجا تنقید بھی کی ہے، مثلاً میں نے اس واقعہ کو فلاں کتاب سے لیکر لکھا ہے، یا فلاں کتاب سے جمع کیا ہے۔

کتاب الاغانی کے متعلق ناقدین ادب کی رائے | کتاب الاغانی ہمیشہ سے علما اور ادبا کے غور و فکر کا موضوع رہی ہے، اس کے متعلق ائمۂ ادب کی رائیں حسب ذیل ہیں:-

[1] کتاب الاغانی ج ۱، ص ۵۶ [2] مقدمہ کتاب الاغانی

۱- وزیر ابو محمد مہلبی لکھتے ہیں: "میں نے ابو الفرج سے پوچھا کہ اس کتاب کی تالیف میں کتنا عرصہ لگا ہے، جواب دیا کہ پچاس سال، لکھنے کے بعد اس کو سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں پیش کیا، اس نے ایک ہزار درہم انعام میں عطا کیے، صاحب[1] بن عباد کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ سیف الدولہ نے کتاب کی ناقدری کی ہے، یہ تو اس سے کہیں زیادہ انعام کی مستحق ہے، کیونکہ یہ کتاب گوناگوں محاسن اور عجیب و غریب واقعات پر مشتمل ہے، اس میں زاہد کے لیے سامان زہد، عالم کے لیے سرمایۂ علم، انشاء پرداز اور طالب علم کے لیے خزانۂ ادب، بہادر کے لیے تذکرۂ شجاعت اور بادشاہوں کے لیے دلبستگی کا سامان موجود ہے، میرے کتب خانہ میں ایک لاکھ سترہزار کتابیں ہیں، لیکن اب یہ تنہا کتاب میری مونس و ہمدم ہے، وہ ایام اور اخبار عرب کا خزانہ ہے، جمع، ترتیب اور حسن تالیف میں یہ کتاب دوسری کتابوں سے سبقت لے گئی ہے"۔[2]

(۲) ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ الرومی معجم الادباء میں لکھتے ہیں: "عمر عزیز کی قسم، یہ جلیل القدر اور مشہور کتاب گوناگوں فوائد پر مشتمل اور فکاہت و متانت دونوں کی جامع ہے، میں نے کئی بار ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا ہے، اور اس کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے تیرہ جلدوں میں لکھا ہے"[3]۔

(۳) علامہ ابن خلدون تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "کتاب الاغانی قاضی ابو الفرج الاصبہانی کی تالیف ہے، جو اخبار عرب، اشعار عرب، انساب عرب، ایام عرب اور وقائع عرب کی جامع ہے، اس کی بنا اُن سو راگوں پر رکھی گئی ہے جو مغنیوں نے ہارون الرشید کے لیے منتخب کیے تھے، اور ابو الفرج نے اس کو کمال تک

---

۱ صاحب بن عباد آل بویہ کے مشہور ادب نواز وزیر تھے، مسجع اور مقفیٰ عبارت لکھنے کے شائق تھے ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔
۲ معجم الادباء، یاقوت ۳ ایضاً ج ۵ ص ۱۵۱

پہنچایا، میری عمر کی قسم یہ کتاب علوم عرب، شعر، تاریخ، غنا، موسیقی اور دوسرے احوال پر مشتمل ہے، میرے علم میں اس کتاب کی دوسری نظیر نہیں"[1]۔

(۴) مشہور مورخ جرجی زیدان رقمطراز ہیں:- "کتاب الاغانی تعریف سے مستغنی اور اپنے باب میں بے مثل کتاب ہے، کہا جاتا ہے کہ ابو الفرج الاصبہانی نے اس کتاب کی تالیف میں اپنی عمر عزیز کے پچاس برس صرف کیے تھے، جب اس کی خبر الحکم بن الناصر والی قرطبہ تک پہنچی تو اس نے اصرار کیا کہ سب سے پہلے یہ کتاب اس کے دربار میں پیش کی جائے، اور اس کا انعام ایک ہزار دینار مقرر کیا، مگر جب یہ کتاب مکمل ہوگئی تو ابو الفرج نے اس کو سیف الدولہ بن حمدان کی خدمت میں پیش کیا اور انعام میں ایک ہزار درہم پائے، اس زمانہ میں کوئی امیر ایسا نہ ہوگا جس کے پاس یہ کتاب نہ رہی ہو، صاحب بن عباد جب سفر پر نکلتا تھا تو بیس اونٹوں پر کتابیں ساتھ رہتی تھیں، لیکن کتاب الاغانی کی تالیف نے ان سے مستغنی کر دیا، اس عظیم الشان کتاب کی ۲۱ جلدیں اور چھ ہزار صفحات ہیں، کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، لیکن اس کی اہمیت موسیقی اور غنا سے زیادہ ادبی علوم کی وجہ سے ہے، اس کتاب میں سینکڑوں شعراء، ادبا، مغنیوں، عشاق، قواد اور خلفاء کے تراجم اور واقعات ہیں، اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو زمانۂ جاہلیت، صدر اسلام اور عہد بنی امیہ کے بہت سے واقعات پردۂ اخفا میں رہ جاتے، ابو الفرج نے بہت سے واقعات اپنے معاصرین سے بھی نقل کیے ہیں، اس لیے یہ کتاب تدوینی لحاظ سے منفرد ہے"[2]۔

(۵) مشہور ادیب صادق الرافعی نے اپنے ایک شاگرد کے نام جو مکاتیب لکھے ہیں ان میں جن کتابوں کا مطالعہ ایک انشاء پرداز کے لیے ضروری قرار دیا ہے، ان میں کتاب الاغانی بھی ہے[3]۔

---

۱ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۶ ۲ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۲ ص ۲۸۱-۲۸۲
۳ رسائل الرافعی

(۶) شام کے مشہور لغوی عالم شیخ عبد القادر المغربی مرحوم نے اس کو عربی زبان کی فصیح ترین کتابوں میں شمار کیا ہے[1]

(۷) عصر حاضر کے صاحب طرز ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں :-

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ کتاب الاغانی زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہ گئی ہے، یہ کتاب بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ کی حیات ادبی اور اجتماعی کے مطالعہ کا بہترین ماخذ ہے"..... میں بھی فرانس جاتا ہوں تو اس کتاب کو ہمراہ لے جاتا ہوں، اور ہر دفعہ اس کے مطالعہ سے نئی لذت حاصل کرتا ہوں[2]......

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ راویوں کے ناموں سے صرف نظر کرکے ہمیں اس کتاب کو تنقید، تحقیق اور تحلیل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے، کیونکہ کتاب الاغانی اور تاریخ طبری نہ صرف ادب اور تاریخ کی کتابیں ہیں بلکہ ادب اور تاریخ کا ماخذ بھی ہیں[3]"

(۸) ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ یہ کتاب علم ادب کو چھوڑ کر تاریخی حیثیت سے چنداں اہمیت کی حامل نہیں، اس کے بہت سے واقعات اور قصص تاریخی اعتبار سے ساقط الاعتبار ہیں،

حیات اجتماعیہ کی چند دلآویز جھلکیاں

طبری، مسعودی اور ابن الاثیر وغیرہ تاریخ کی معتبر کتابیں ہیں لیکن یہ زیادہ تر سیاسی واقعات، محاربات اور خلفاء کی آل و اولاد کے تذکروں پر مشتمل ہیں، ان میں عربوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں، کتاب الاغانی اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں عوامی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے، ابوالفرج نے اپنے زمانہ کی سوسائٹی کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور ہر طبقہ کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا، اس زمانہ

[1] الاشتقاق والتعریب [2] حدیث الاربعاء ج ۲ ص ۱۲۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۳-۱۴

کی حیات اجتماعی کی چند دلآویز جھلکیاں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں،

۱۔ عوام کالانعام ہوتے ہیں

عثمان الوراق روایت کرتے ہیں کہ میں نے عتابی[1] کو باب الشام کے پاس سر راہ روٹی کھاتے دیکھا، میں نے کہا تمھیں یہاں روٹی کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی، کہنے لگا گائے کے سامنے تم کو کھانے میں شرم آئے گی؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا ذرا ٹھہرو، میں تمھیں دکھائے دیتا ہوں، عوام ڈھور ڈنگروں سے زیادہ نہیں، یہ کہکر وہ وعظ کہنے لگا، اور ایک قصہ سنانا شروع کیا، اس کو سننے کے لیے لوگوں کا اژدحام ہوگیا، اور عتابی نے کہا "بہت سے راویوں سے مجھے روایت پہنچی ہے کہ جو کوئی اپنی زبان نکال کر ناک کے بانسہ تک لیجائے گا، اس پر آتش دوزخ حرام ہوگی، یہ سنکر تمام حاضرین اپنی زبان نکال کر ناک تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگے، جب مجمع منتشر ہوگیا تو مجھ سے کہنے لگا کہ اب بتلاؤ کیا ان لوگوں میں اور گایوں میں کچھ فرق ہے۔ (کتاب الاغانی جلد ۱۳ ص ۱۴، بحوالہ دراسۃ الاغانی)

(ب) مکتب کے بچوں کی شرارتیں

احمد بن عبید اللہ بن عمار نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم ابو العباس[2] المبرد کی مجلس درس میں تحصیل علم کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے، وہ جو کچھ علم ادب اور تاریخ کے متعلق ہمیں بتلاتے تھے، ان کو ہم لکھ لیا کرتے تھے، ہمارے ساتھ ایک خوبرو اور خوش پوشاک نوجوان بھی جایا کرتا تھا جس کے حالات سے ہم ناواقف تھے، ایک دن ہم سب درس سے فارغ ہوکر ایک جگہ بیٹھکر اپنی یادداشتوں کا مقابلہ کر رہے تھے کہ ایک خوبصورت کنیز نے آکر اس نوجوان کی گود میں ایک رقعہ ڈال دیا، اس رقعہ پر عنبر کی مہر لگی ہوئی تھی، نوجوان نے ہم لوگوں سے علٰحدہ ہوکر یہ رقعہ پڑھا اور اس کا جواب لکھ کر اس کنیز کو دیدیا،

[1] عتابی ایک قصہ گو بزرگ تھے [2] ابو العباس المبرد ادب عربی کے مشہور امام ہیں، ادب میں الکامل انکی مشہور کتاب ہے

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم چھڑی لے کر آیا، اور اس نے ہمارے ساتھی کی خوب مرمت کی، ہم نے بڑی مشکل سے اس کو چھڑایا اور اس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ اس رقعہ میں کیا لکھا تھا، جواب ملا کہ اس میں یہ شعر لکھا ہوا تھا،

کفی حزنا انا جمیعا ببلدۃ — کلانا بہا ثاو و لا نتکلم

ہمارے غم و اندوہ کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ہمکلام نہیں ہو سکتے۔

میں نے بھی اس کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا جس کا یہ مطلب ہے کہ ہم بیلو کے درختوں کے پاس ملاقات کر سکتے ہیں، ہم نے پوچھا کہ تم نے ہمیں اس معاملے سے کیوں بے خبر رکھا، پھر ہم لوگوں نے اس کی ایسی درگت بنائی وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا، اس واقعہ کے بعد پھر کبھی اس نوجوان سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ (کتاب لاغانی ج ۶ ص ۱۵۳)

(ج) محفل عیش و طرب | زبیر بن بکار اپنے ماموں مصعب کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کوفہ میں کہا کرتا تھا کہ میرے والد نے بلور کا ایک بڑا پیالہ ولید کی خدمت میں پیش کیا جو نہایت عمدہ اور بے نظیر تھا، جب شام ہوئی تو مے نوشی کا دور شروع ہوا، اتفاق سے رات بھی چودھویں کی تھی، اور چاند کا عکس پیالے میں پڑنے لگا، ولید نے پوچھا، آج کی رات چاند کس منزل میں ہے، بعض نے کہا برج محل میں، بعض نے چاند کی ساری منزلیں گنانی شروع کر دیں، کسی نے کہا چاند تو پیالے کی منزل میں آگیا ہے، ولید نے کہا تجھ پر خدا کی مار، تو نے میرے دل کی بات کہدی، (کتاب لاغانی جلد ۶ ص ۱۲۶)

اس قسم کے مناظر کتاب میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں، جن کی تفصیل طویل ہوگی۔

نقد الادب | ابو الفرج عربی شعر و ادب کے بہت بڑے ناقد ہیں، وہ اپنی میزان نقد میں شعراء کے محاسن و معائب یکساں طور پر وزن کرتے ہیں، ولید یزید کے متعلق لکھتے ہیں

(۱) خمریات میں ولید بن یزید کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جو بعد میں شاعروں کے لیے

نمونہ بنے، خاص کر ابو نواس نے ان اشعار کے معانی کو اپنے الفاظ میں سمو کر بہت سی غزلیں لکھی ہیں، اور ان مطالب و معانی کو جا بجا دہرایا ہے۔ (کتاب لاغانی ج ۲ ص ۸۰)

(۲) ابو العتاہیہ کے کلام کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:۔ "اس کی شاعری افکار و معانی کا خزانہ ہے، اس کے اشعار سہل و سلیس اور تصنع و تکلف سے پاک ہیں، بعض شعروں میں سخیف اور بازاری الفاظ بھی ملتے ہیں، بہت سے اشعار زہد، دانائی کے مضامین اور ضرب الامثال پر مشتمل ہیں، اس کے معاصرین کا خیال ہے کہ وہ بعض فلاسفہ کی طرح حشر و نشر کا قائل نہ تھا،

اس نے بعض نئے اور مزاحیہ اوزان ایجاد کیے ہیں، (ایضاً ج ۳ ص ۱۲۲)

(۳) مشہور عباسی شاعر ابن المعتز کی شاعری کے متعلق یہ رائے ہے کہ اس کے کلام میں شاہانہ رقت، ظریفوں کا تغزل اور ترقی پسندوں کی شان و شوکت ہے، ابن المعتز کی شاعری خوبی اور صفائی میں متقدمین سے کسی طرح کم نہیں، اس نے شاہی محلات کی چمک دمک پھولوں کی مہک اور کنیزوں کے جھرمٹ میں پرورش پائی تھی، اس لیے اس کے کلام میں ریگستانوں، اونٹوں، ہرنیوں اور اجڑے دیار کی تلاش بے سود ہے (ایضاً ج ۹ ص ۱۴۲)

(۴) عباس بن الاحنف کے متعلق رقمطراز ہیں، "عباس بن الاحنف نے اپنے کلام کو کسی امیر، وزیر یا خلیفہ کی مدح یا ہجو سے آلودہ نہیں کیا اور نہ اپنی شاعری کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا، اس کی طبع فیاض صرف غزل گوئی میں منحصر اور محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور یہی اس کے کمال فن کی دلیل ہے، (ایضاً ج ۸ ص ۱۵)

ابو الفرج کا اسلوب بیان | ابن المقفع، جاحظ، ابن قتیبہ اور طبری کی تصانیف عربی زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، ان کا طرز نگارش، سلاست زبان اور فصاحت بیان کا

عمدہ نمونہ ہے، لیکن ابو الفرج کی سادہ اور شیریں بیانی بھی اپنا جواب نہیں رکھتی، بلکہ حلاوت، گھلاوٹ اور دلآویزی کے اعتبار سے ابو الفرج کا اسلوب بیان ان جاروں سے بڑھا ہوا ہے، وہ شادی اور غمی کی تقریبات، ملوک جاہلیت اور خلفائے اسلام کے واقعات، علماء اور امراء کی مجالس ادب، عوامی زندگی کے مشاہدات یکساں مہارت کے ساتھ نہایت سادہ اور روزمرہ کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، ان کے ہلکے پھلکے الفاظ اور شہد و قند میں گھلی ہوئی ترکیبیں سحر حلال کا حکم رکھتی ہیں، ان کا اسلوبِ نگارش سجع اور قافیہ بندی کے اُن التزامات سے پاک ہے، جو بدیع الزماں الہمدانی، ابو القاسم الحریری اور قاضی الفاضل کی انشاء کا طغرائے امتیاز ہیں، وہ اپنی تصانیف میں وہی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو اس زمانے کے لوگوں کی زبانوں پر چڑھی ہوئی تھیں، شام کے مشہور ادیب اور نقاد استاد شفیق جبری کی تحقیق میں کتاب الاغانی کے بہت سے الفاظ اور ترکیبیں آج بھی شام میں مستعمل ہیں۱؎، اور یہی اس کتاب کے زندہ جاوید ہونے کی دلیل ہے، ابو الفرج کی مہارت انشاء کا دوسرا راز روایات کے منطقی تسلسل اور انسجام میں ہے، وہ جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں، تو اس کی کڑیاں خود بخود جڑتی چلی جاتی ہیں، ان میں کہیں بھی جھول یا بے ربطی نظر نہیں آتی، انکی سحر نگاری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں،

(۱) مشہور مغنی اسحق بن ابراہیم الموصلی کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ جب بولتا تو بولنے والا چپ اور سننے والا حیران رہ جاتا، مجلس نشین اس کی باتیں سننے نہ تھکتا، کان اسکی گفتگو کے شائق رہتے، اس کی بات چیت سے خوشی اور بحث و مباحثہ سے علم میں اضافہ ہوتا، اس کا گانا طرب انگیز ہوتا اور دنیا و ما فیہا سے غافل کر دیتا"

(کتاب الاغانی جز ۱۰ ص ۱۱۷)

۱؎ دراستہ الاغانی ص ۲۱۴

ابو الفرج کو نفسیاتی حالات لکھنے میں بھی کمال حاصل ہے، ایک دبلے پتلے عاشق زار یدو کی زبانی اسکی نفسیاتی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"بعض دفعہ مجھ پر کچھ گھڑیاں ایسی بھی گذرتی ہیں جن میں مجھ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان میں، محبوبہ کی یاد آتی ہے تو میں ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں، اسکی یاد محو ہو جاتی ہے تو میں پھر صحیح العقل ہو جاتا ہوں"

ایک بوڑھے نے نوجوان مغنیہ کا گانا سنکر کہا" سر سے لیکر پاؤں تک کوئی چیز مجھ میں سرایت کر گئی اور جب دل پر اثر ہوا تو میں کچھ حماقت کر بیٹھا" (ایضاً ج، ص ۱۵)

عہد اسلام اور خلفائے عباسیہ کے زمانے میں شراب کا کاروبار یہود و نصاری کیا کرتے تھے، اور ان کی دوشیزہ لڑکیاں ساقی گری کی خدمت انجام دیتی تھیں، اس لیے انکی رعنائی، زیبائی اور عشوہ گری عرب شاعروں کا محبوب موضوع رہی ہے، ابو الفرج ایک کلال کی لڑکی کی مدح و توصیف نثر میں اس طرح کرتے ہیں:-

"بوٹا سا قد، دینار جیسا دمکتا ہوا چہرہ، لمبے بال، دہن کشادہ، ہنستی تو معلوم ہوتا کہ چمن میں پھول کھلے ہوئے ہیں، اسکی باتیں شہد سے زیادہ میٹھی تھیں" (ایضاً ج ۵ ص ۹۵)

کتاب الاغانی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی ساری کائنات شعر و نغمہ میں ڈوبی ہوئی تھی، عوام تو عوام خواص اور ارباب مذہب بھی غنا اور موسیقی سے شغف رکھتے تھے، اور ان کا یہ ذوق ان کے تقدس میں قادح نہ تھا، ارباب نشاط کی وہ قدر دانی تھی کہ دوسرے اہل کمال ان کے آگے ماند پڑ گئے تھے، شاہی محلات میں غلاموں، کنیزوں اور رومی لونڈیوں کا حکم چلتا تھا، صوبہ داروں اور دیگر عہدہ داروں کا عزل و نصب بھی ان ہی کے مشورہ سے ہوتا تھا، خلفاء رنگ رلیوں اور عوام عیش و عشرت میں ڈوبے

ہوئے تھے، اور عیش پسندی، تن آسانی اور ارباب سیاست کی جاہ طلبی خلافت عباسیہ کو
لے ڈوبی،

کتاب الاغانی کے اڈیشن

کتاب الاغانی کی پہلی جلد ۱۸۴۰ء میں جرمنی سے لاطینی ترجمہ کے ساتھ شائع
ہوئی، یہ جلد با اعراب ہے، اس اڈیشن کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا مطبع بولاق کا احسان ہے کہ
اس نے ۱۸۶۸ء میں مکمل کتاب کو پہلی دفعہ شائع کرکے اس علمی خزانہ کو وقف عام کردیا، ۱۸۸۸ء
میں ایک جرمن مستشرق روڈلف برونونے اس کتاب کی ۲۱ ویں جلد شائع کی لیکن غور سے دیکھنے
سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی مستقل حصہ نہیں ہے، بلکہ بعض زیادات کا مجموعہ ہے، ۱۹۰۰ء میں مشہور اطالوی
مستشرق استاد گوئیڈی نے بولاق اڈیشن کا انڈکس شائع کرکے عظیم الشان علمی خدمت انجام دی،
یہ انڈکس جو فرانسیسی زبان میں ہے، چار جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی فہرست میں شعرا کے نام ہیں،
دوسری میں قوافی، تیسری میں اعلام الرجال والنساء، اور قبائل وغیرہ ہیں اور چوتھی میں
شہروں، قصبوں اور مختلف مقامات کے نام آگئے ہیں، مطبع بولاق کا دوسرا اڈیشن
محمد آفندی الساسی نے چھپوایا تھا، جس میں ۲۱ ویں جلد کے زیادات بھی آگئے ہیں،
ان اڈیشنوں کے علاوہ اب بھی ایک ایسے اڈیشن کی ضرورت تھی جو تصحیح، ترتیب اور
تحشیہ کے جملہ لوازم سے آراستہ ہو، اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دار الکتب المصریہ
نے اس بے مثل کتاب کی طباعت کا انتظام کیا، اب تک اس کی سولہ ۱۶ جلدیں شائع ہوچکی
ہیں اور چار ابھی باقی ہیں، بیروت سے بھی کتاب الاغانی کے دو تین اڈیشن نکلے ہیں، لیکن
ان میں کوئی خوبی نہیں، وہ مصری اڈیشن کی نقل در نقل ہیں،

کتاب الاغانی کے مختصرات

کتاب الاغانی کے مختصرات کی تعداد بھی کافی ہے، ان میں سب سے
زیادہ مشہور ابن المنظور المصری مؤلف لسان العرب کا ہے، جس کا نام مختار الاغانی

فی الاخبار والتہانی ہے، مصری حکومت کی قدردانی سے اس کی سات جلدیں پارسال
شائع ہوچکی ہیں، دوسرا اختصار ابن الواصل الحموی کا ہے جس کا نام تجرید الاغانی
ہے، سابق الذکر کی طرح اس میں بھی اسانید کو حذف کردیا ہے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی
معارف پروری سے اس کے چھ حصے شائع ہوچکے ہیں اور دو باقی ہیں، لیکن ادبی دنیا
میں زیادہ چلن رنات المثالث والمثانی کا ہے، جسے آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر
ایک عیسائی فاضل نے بیروت سے شائع کیا تھا،

مراکش — آئینۂ ایام میں

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

یہ مضمون مراکش کے رسالہ "دعوۃ الحق" کے خاص نمبر —— جو مراکش کے فرمانروا مولائے حسن ثانی کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر نکلا ہے —— کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

مراکش براعظم افریقہ کے انتہائی شمال میں ساحل سمندر پر واقع ایک زرخیز اور سرسبز وشاداب ملک ہے، ابھی اس کی آزادی کو چند ہی سال ہوئے ہیں، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے سیاسی، تمدنی، تجارتی اور صنعتی ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، آج اس کی خوشحالی اور شادابی کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی یہ ملک عروج وزوال کے پرآشوب دور سے بھی گذرا ہے،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سترہویں صدی عیسوی ہی میں ترکی مریض نیم جان ہو چکا تھا، لیکن ابھی اس کے مرکز قسطنطنیہ میں عثمانیوں کی تلوار برق وصاعقہ بنکر چمک رہی تھی جس سے یورپین اقوام ایک زمانہ تک خوف وہراس محسوس کرتی رہیں، لیکن انیسویں صدی کا اواخر ترکوں کے عروج واقبال کے لیے نقطۂ زوال وادبار ثابت ہوا، ان کی اس کمزوری کا ردعمل یورپ میں ظاہر ہونا طبعی تھا، چنانچہ جب اسلامی دنیا کا شیرازۂ اتحاد منتشر ہوا تو یورپ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگیں، ادھر جبرالٹر پر برطانیہ کے قبضہ کے بعد مغربی ملکوں میں ملک گیری کی دوڑ شروع ہوگئی جس میں کوئی ملک بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کرسکتا تھا، خاص طور سے

برطانیہ، فرانس اور جرمنی ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی زیادہ کوشش میں تھے، یورپین اقوام کے اس استبداد اور استعمار کی خونچکاں داستان بہت طویل ہے، یہاں اس کی تفصیل میں پڑے بغیر صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ افریقہ کے شمالی ساحل پر جو عرب ممالک آباد ہیں وہ انیسویں صدی کے وسط تک خود مختار اور یورپ کی دستبرد سے محفوظ تھے، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس طرف بھی یورپ نے قدم بڑھائے اور مسلم فرمانرواؤں کی ناعاقبت اندیشی اور اختلاف کے باعث ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس کے قبضہ سے جو ابتدا ہوئی تھی وہ بیسویں صدی کے اوائل میں شمالی افریقہ کی سب سے آخری آزاد سلطنت لیبیا پر اٹلی کے تسلط پر ختم ہوئی، اس طرح مسلمانوں کی بدبختی پر آخری مہر ثبت ہوگئی،

شمالی افریقہ کے یہ ساحلی ملک عرصہ سے یورپ کی نظر میں چڑھے ہوئے تھے، کیونکہ یہ تمام علاقے انتہائی زرخیز اور سرسبز وشاداب ہیں، بالخصوص مراکش کے چار لاکھ پچاس ہزار مربع کیلو میٹر پر محیط علاقہ کا محل وقوع سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، آبنائے جبرالٹر کے عین مقابل ہونے کے علاوہ اس کے ایک طرف کے ساحل سے بحر روم ٹکراتا ہے، اور اسکے دوسری طرف بحر اوقیانوس لہریں لیتا ہے، ایسا محل وقوع ہر مغربی ملک خاص طور سے برطانیہ کے لیے بڑا خطرہ اور اس پر قبضہ ایک بڑی دولت تھا، اس لیے جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں سے ہر ایک کی کوشش یہی رہی کہ وہ کسی طرح اس دولت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے، وہیں ایک اہم سبب مراکش پر تسلط قائم کرنا بھی تھا، اس کوشش میں ہر مغربی ملک دوسرے کا رقیب بن گیا تھا، اور اسی رقابت کا نتیجہ جنگ عظیم چھڑنے سے پانچ سال پہلے فرانس اور جرمنی کے درمیان جھڑپ کی شکل میں ظاہر ہوا تھا،

بہر حال شمالی افریقہ کے سارے ساحلی ممالک (الجزائر، طرابلس، تیونس، مراکش) یورپ کے قبضہ میں چلے ضرور گئے، لیکن آزادی وحریت کی قندیل برابر ابنائے وطن کے سینوں میں فروزاں رہی، اور وہ اس کے حصول کے لیے جان کی بازی لگاتے رہے، اس سلسلہ میں الجزائر کے امیر عبد القادر، طرابلس کے محمد بن علی سنوسی اور مراکش کے امیر عبد الکریم کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، جو اگرچہ آزادی کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے جذبۂ آزادی کا جو شعلہ مسلم نوجوانوں کے سینوں میں بھڑکا دیا تھا، وہ کبھی سرد نہ ہو سکا، اور ان ممالک کی آزادی کا سلسلہ شروع ہو گیا، سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں لیبیا (طرابلس) اٹلی کے پنجہ سے آزاد ہوا، اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سرفروشانِ مراکش کی جد وجہد آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوئی، پھر ۱۹۵۶ء میں ٹیونس نے فرانس کے چنگل سے رہائی حاصل کی، اور سب سے آخر میں الجزائر نے مسلسل سات سال تک فرانس سے نبرد آزما ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء میں طوق غلامی اتار پھینکا، اس کے لیے اس کو اپنے دس لاکھ فرزندوں کی قربانی کرنی پڑی،

ذیل میں مراکش کی اجمالی تاریخ، مختلف زمانوں میں اس کی سیاسی سرگذشت اور آزادی کے بعد اس کی ترقی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا،

مراکش کی وجہ تسمیہ

مراکش دراصل اس ملک کا ایک مرکزی شہر ہے، جس کے نام سے اب پورا ملک موسوم ہو گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں یہ مراکش نامی ایک رہزن کی جائے سکونت تھی، خاندان مرابطین کے پہلے بادشاہ سلطان یوسف بن تاشفین کو اس شہر کی تعمیر کا فخر حاصل ہوا، یورپ اس ملک کے باشندوں کو مور قوم کے نام سے موسوم کرتے تھے، چنانچہ اسی نسبت سے اس علاقہ کو مراکو بھی کہا جاتا ہے، عربوں میں اس کا زیادہ مشہور نام المغرب الاقصیٰ ہے،

رقبہ اور آبادی

مراکش کا رقبہ چار لاکھ پچاس ہزار مربع کیلو میٹر اور آبادی ایک کروڑ سولہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں مسلمان ۹۶ فیصدی ہیں، عہد غلامی میں یہ ملک تین حصوں میں منقسم اور اس کا بڑا حصہ فرانس کے قبضہ میں تھا، اس کے بعد ۲۰ ہزار مربع میل کے علاقہ پر اسپینی قابض ہوئے، اور طنجہ کا تھوڑا سا علاقہ بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد تھا، مراکش کا سب سے زرخیز علاقہ جبل اطلس کے مغرب کا ہے، جو اگرچہ رقبہ میں کم ہے لیکن ملک کی اقتصادی ضروریات کو بڑی حد تک وہی پورا کرتا ہے،

مراکش میں اسلام

سرزمین مراکش پر اسلام کا جھنڈا ساتویں صدی عیسوی کے اواخر ہی میں بلند ہو گیا تھا، لیکن اس کے باشندے بار بار باغی ہو جاتے تھے، اس لیے ۶۸۲ء میں عقبہ بن نافع والی افریقہ نے ایک شدید خونریز جنگ کے بعد انھیں شکست دی اور بڑھتا ہوا طنجہ تک پہنچ گیا، عقبہ کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اسلامی حکومت کے حدود کو بڑی وسعت دی اور شمالی افریقہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد اس قدر مضبوط کر دی کہ عربوں کے قدم اس خطہ پر ہمیشہ کے لیے جم گئے، اس علاقہ کے قدیم باشندے بربر طبعاً بڑے سرکش اور جنگجو واقع ہوئے تھے، اور برابر مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرتے تھے، لیکن جب عربوں نے بزور قوت انھیں زیر کر لیا، تو پھر وہ اسلام کے ایسے فدائی بن گئے کہ بیس ہزار بربری اندلس فتح کرنے کے لیے طارق بن زیاد کے ساتھ سربکف نکل کھڑے ہوئے، اور طوفان باد و باراں کی طرح اسپین پر چھا گئے،

آج بھی مراکش میں غالب اکثریت مسلمانوں ہی کی ہے، البتہ فقہی مذاہب بدلتے رہے ہیں، دسویں صدی عیسوی تک حنفی مذہب کا غلبہ رہا، اس کے بعد امام مالک کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا، اس وقت تک اسی کے متبعین کی اکثریت ہے۔

مرکزی شہر پہاڑ اور دریا

مراکش کے خاص خاص شہر یہ ہیں: دار البیضاء، فاس، رباط، مراکش، مکناسہ، طنجہ، سبتہ، وجدہ، وزان، سلا، تازا، سلا، تازا، تیطوان، القصر الکبیر، اصیلا، الصویرہ، الجدیدہ، العرائش، اسفی۔ فاس (جسے فیض بھی کہا جاتا ہے) اس ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے، موجودہ دار السلطنت رباط میں ہے۔

یہاں پہاڑوں کے کئی سلسلے ہیں، سب سے طویل اور بلند کوہ اطلس کا سلسلہ ہے، جبل تجوت اس کی بلند ترین چوٹی ہے، جس کی اونچائی ۱۳ ہزار فٹ ہے، اس کے بعد دس ہزار فٹ بلند جبل بو ایلان کا نمبر ہے، اسی طرح جبل ریف کے سلسلوں میں سب سے بلند چوٹی تیزی رون کی ہے جو آٹھ ہزار فٹ اونچی ہے۔

مشہور دریاؤں کے نام یہ ہیں: ام الربیعہ، وادی ملویہ، وادی تان سیفت، وادی سیبو۔

پیداوار

مراکش کا قابل کاشت خطہ نسبۃً کم اور ریگستان اور بنجر زیادہ ہے، کوہ اطلس کے شمال کا حصہ پیداوار اور آب وہوا میں جنوبی یورپ سے مشابہت رکھتا ہے، جنوب کے میدان اور وادیاں کھجور کی کثرت کے سبب بحر النخل کہلاتی ہیں، موجودہ قومی حکومت ٹیکنیکل ذرائع سے زمین کو زیادہ سے زیادہ قابل کاشت بناتی جارہی ہے، یہاں کے پہاڑوں کے دامن میں سنگ مرمر کا بڑا خزانہ محفوظ ہے، اس کے علاوہ لوہا، فاسفیٹ، جست اور سیسہ جیسی معدنیات بھی اس کی زمین میں مدفون ہیں، جن کو رفتہ رفتہ نکالا جارہا ہے، گیہوں، جو، چاول، باجرا، کھجور، زیتون اور روئی یہاں کی خاص پیداوار ہے، میووں میں انجیر، انگور، بادام، آلو بخارا اور زردآلو بافراط پیدا ہوتا ہے، مصنوعات میں چمڑے، چاندی اور سونے کے کام کی کثرت ہے،

خود مختار حکومت کا قیام

۷۸۸ء میں عرب کے ایک نامور قبیلہ کے رکن ادریس بن عبد اللہ

حجاز سے مراکش کے صوبہ ولیلی میں وارد ہوئے، انہی نے ایک خود مختار و مستقل اسلامی حکومت کی حیثیت سے ملک مراکش کی بنیاد رکھی، اور فیض کا شہر بسایا، مولائے ادریس صرف ۴ سال حکومت کر پائے تھے کہ خلیفہ ہارون الرشید کی سازش سے شہید کر دیے گئے، پھر ان کے بعد ان کے لڑکے ادریس ثانی حکمراں ہوئے، ان دونوں کے مزار فیض کے قریب زرہون نامی قصبہ میں آج بھی مرجع خلائق ہیں،

یہ خاندان دو سو سال تک حکمراں رہا، دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک بربری قبیلہ بن مقدرہ۔ ادریسیوں کو نکال کر خود حکمراں بن گیا، مراکش کے اصل اور قدیم باشندے بربری ہیں، اسلامی فتح کے بعد عرب بکثرت یہاں آکر آباد ہوگئے اور صدیوں کے طویل اختلاط کی بنا پر بربری اسلامی روایات اور اس کی معاشرتی و تمدنی زندگی سے اس قدر مانوس ہوگئے کہ پھر وہ ملک و اسلامی تہذیب کی ترقی میں عربوں کے دوش بدوش ہوگئے،

سولہویں صدی عیسوی میں مراکش میں سعدیین کا ظہور ہوا، جو اپنی سیادت کی بنا پر شریفی کہلاتے تھے، یہ خاندان صدیوں مراکش کا حکمراں رہا اور اسی کے آخری تاجدار کے زمانہ میں فرانس نے مراکش میں اپنا اقتدار قائم کیا، مراکش میں بارہ سو سال تک اسلامی حکومت کا جھنڈا لہراتا رہا، اور اس طویل مدت میں الموحدین، المرابطین، سعدیین اور علویین چار خاندانوں نے داد حکمرانی دی،

مراکش کی سیاسی اہمیت

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مراکش اپنے محل وقوع کی وجہ سے تجارتی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کے مغرب میں بحر اطلانتک، شمال میں بحر روم و اسپین، اور جنوب و مشرق میں الجزائر و صحاری واقع ہیں، اس کے انتہائی شمالی شہر سبتہ اور طنجہ آبنائے جبرالٹر (جبل الطارق) کے عین مقابل میں ہیں، جو مغربی اقوام

کے لیے بحر اوقیانوس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، اس کی اس اہمیت کے باعث جب انیسویں صدی کے اواخر میں مراکش کی خود مختار سلطنت کمزور ہوئی تو اقوام یورپ کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں، مگر فرانس نے پیش قدمی کرکے اس پر قبضہ کرلیا، اور جرمنی و برطانیہ شور و واویلا مچا کر رہ گئے،

مراکش پر یورپین قبضہ

مولائے حسن ثالث مراکش کے آخری تاجدار تھے جنھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا، اور مغرب کی ہر سازش کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا، ۱۸۹۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا، ان کے بعد ان کا تیرہ سالہ بیٹا عبدالعزیز تخت نشین ہوا، اس کی نابالغی کی وجہ سے وزیر سید محمد بن موسیٰ حکومت چلاتا رہا، اس وقت تک مراکش اجنبی اثرات سے محفوظ رہا، ۱۹۰۰ء میں سید محمد کی موت کے بعد جب اقتدار سلطان کے ہاتھوں میں آیا تو مغربی ملکوں نے مراکش پر قبضہ کرنے کی کوشش شروع کردی، سلطان عبدالعزیز اگرچہ ذہین اور زیرک تھا، لیکن نوجوانی کی وجہ سے عیش و عشرت کا دلدادہ تھا، اس کی فضول خرچی حد سے بڑھ گئی تھی، اس سے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی، اور بہت سے قبائل بغاوت پر آمادہ ہوگئے، مغربی طاقتیں ایسے موقع کے انتظار ہی میں تھیں، چنانچہ فرانس نے قبائلی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے اپنی امداد پیش کی، جس کو ناتجربہ کار سلطان نے قبول کرلیا، اس طرح مراکش میں فرانس کی مداخلت کا آغاز ہوگیا، اور وہ مختلف طریقوں سے اپنے تسلط کی راہ ہموار کرتا رہا،

جرمنی کو جس نے ۱۸۷۰ء میں فرانس کو شکست فاش دی تھی، مراکش میں اس کا اقتدار گوارا نہ ہوا، اس نے اس کے خلاف آواز بلند کی، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مراکش کے سوال پر سمجھوتہ کرکے دونوں رقیب وقتی طور پر گلے مل گئے، اس صلح نامہ کی رو سے یہ دونوں ملک مراکش کے ہر معاملہ میں مداخلت کے برابر کے حصہ دار ہوگئے تھے، لیکن فرانس اپنی عیاری سے اپنے اثر و نفوذ

کو برابر بڑھاتا رہا، اس سے عوام میں ہیجان پیدا ہوا، اور ملک میں جا بجا اسکے خلاف بلوے ہونے لگے یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں سلطان عبدالعزیز کے بھائی عبدالحفیظ نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا، بہت سے قبائل اس کے ساتھ ہوگئے، سلطان عبدالعزیز ان تمام شورشوں کو دبانے اور امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہا،

فرانس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دار البیضا (کاسابلانکا) میں اپنی فوجیں اتار دیں، اور دھیرے دھیرے یہاں فرانس کے قدم مضبوط ہوتے گئے، ۱۹۱۳ء میں مغربی ملکوں میں بڑی چپقلش کے بعد مراکش تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا، جس حصہ پر فرانس کا پہلے سے قبضہ تھا، وہ مستقل طور پر اس کے اقتدار اور تسلط میں چلا گیا، شمال مغرب کے کچھ ساحلی علاقے پر اسپین نے پنجے جمائے، اور طنجہ کا سوا دو سو مربع میل کا علاقہ اہم تجارتی گذرگاہ ہونے کی وجہ سے ایک بین الاقوامی اسمبلی کے سپرد کردیا گیا، اس طرح سب سے بڑا اور اہم علاقہ فرانس کے زیر تسلط رہا، اسی میں کوہ اطلس کے شمال کا وہ حصہ بھی شامل تھا، جو معدنیات اور پیداوار میں دولت کی کان ہے۔

مراکش کی تقسیم کا یہ فیصلہ جرمنی کے علی الرغم کیا گیا تھا، اس نے اٹلی اور برطانیہ کے دباؤ سے وقتی طور پر اس کو مان لیا تھا، لیکن یہ چیز اس کے دل میں برابر کھٹکتی رہی، جس کا نتیجہ پہلی جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا،

جد و جہد آزادی اور امیر عبدالکریم

لیکن مغربی قوموں کی قوت اور سازشیں اہل مراکش کے جذبۂ آزادی کو نہ دبا سکیں، وہ وقتاً فوقتاً ابھرتا رہا، جس کے ایک سرفروش مجاہد غازی عبدالکریم ہیں، ان کا نام مراکش کی تاریخ میں اتنا ہی روشن ہے، جتنا امیر عبدالقادر کا الجزائر کی تاریخ میں، اور محمد بن علی سنوسی کا طرابلس کی۔ شکیب ارسلان نے امیر عبدالکریم کی عظمت، انکے

مدبر اور کمال کے سامنے لینن اور مصطفی کمال جیسے عباقرہ کو بھی ہیچ قرار دیا ہے، کارل بروکلمان نے لکھا ہے کہ مراکش کے بطل حریت امیر عبدالکریم کا نام ملک کے ذرہ ذرہ پر ہمیشہ نقش رہیگا۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک مراکش کے حریت پسندوں نے بغاوت کی آگ برابر روشن رکھی، جب حالات حد سے بڑھ گئے تو اسپین نے باغیوں کی سرکوبی کرنی چاہی، اگرچہ بغاوت کا زیادہ زور فرانسیسی مراکش میں تھا، لیکن اسپینی مراکش میں بھی اس کی لہریں پہنچی تھیں، اس لیے ۱۹۲۳ء میں اسپین نے برطانیہ سے جدید آلاتِ حرب حاصل کرکے مراکش کے میدانی علاقے ریف پر حملہ کر دیا،

اسپین کی ان تیاریوں اور فوجی نقل و حرکت سے اہل ریف کے عزم و استقلال میں ذرہ برابر تزلزل پیدا نہ ہوسکا، دونوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں اسپین کو سخت جانی و مالی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، اس جنگ کی قیادت امیر عبدالکریم جیسے جانباز بطل حریت اور اسلامی غیرت و حمیت کے پیکر کے ہاتھوں میں تھی، حقیقت یہ ہے کہ جن ناساز گار حالات میں امیر موصوف نے اسپین کو شکست دی، اس نے پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دیا،

لیکن ۱۹۲۶ء میں جب اسپین نے اپنی اس شکست کا داغ مٹانے کے لیے فرانس کے ساتھ مل کر متحدہ حملہ کیا، تو امیر عبدالکریم اور ان کی مختصر جماعت اس کی تاب نہ لاسکی، اور اسکو مجبوراً ہتھیار ڈال دینے پڑے، امیر موصوف کو گرفتار کرکے پہلے مرسیلیا اور پھر جزیرہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا،

عہد غلامی میں مراکش کا نظام حکومت

فرانس اور اسپین نے مراکش پر قبضہ کرنے کے بعد اسکا نظام یہ بنایا کہ تخت حکومت پر تو نام کے لیے سلطان کو بٹھائے رکھا، لیکن حکمرانی کے سارے اختیارات اپنے

ہاتھ میں رکھے، اس سے یہ مقصد تھا کہ عوام کو غلامی کا احساس نہ رہے، اور وہ غیر ملکی تسلط کے خلاف شورش و بغاوت نہ کر سکیں لیکن یہ محض خوش فہمی تھی،

تمام اختیارات اسپینی گورنر اور فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو حاصل تھے، جنھیں اپنے اپنے مقبوضات میں دونوں حکومتیں مقرر کرتی تھیں، سلطان کی بے بسی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی بیرونی ملک سے معاہدہ تو کیا خط و کتابت بھی نہیں کرسکتا تھا، نہ کسی بڑے عہدہ دار کو ملازم یا موقوف کرسکتا تھا، تمام چھوٹے بڑے امور میں وہ اپنے حاکم کا دستِ نگر ہوتا تھا، اس طرح مراکش کے عوام عرصۂ دراز تک فرانس اور اسپین کے مشقِ ستم بنے رہے، مگر اس دوران میں بھی آزادی کی تحریک کسی نہ کسی شکل میں برابر جاری رہی، عربوں میں سیاسی بیداری اور ملی شعور پوری طرح پیدا ہوچکا تھا، اسلیے حصول آزادی کی راہ میں انھوں نے ہر قسم کی قربانیاں کیں، بالآخر فرانس کو ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی کا اعلان کرنا پڑا،

آزادی کے بعد

آزادی کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد مراکش کے پہلے فرمانروا مرحوم مولائے محمد خامس قرار پائے، جو سادات حسنی سے تعلق رکھتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے ولی عہد مولائے حسن ثانی ۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے، ان کے عہد سے مراکش کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا، مولائے حسن نے دار البیضاء (کاسابلانکا) میں اپنے جشنِ تاجپوشی کی تقریب میں جو تقریر کی تھی، اس سے ان کی پالیسی پر پوری روشنی پڑتی ہے، انھوں نے کہا:۔

ہم نے اپنے اس عزیز وطن کو اغیار کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں، اس لیے اب ہمارا سب سے اہم اور مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم ہر حیثیت سے

اپنے کو اس آبائی وراثت کا اہل ثابت کریں، بلاشبہہ اسلام کی ابدی تعلیمات آج بھی انسانی دلوں کو حق وصداقت کی روشنی سے منور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، بس ہمارا ہر قول اور ہر عمل اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے، اسی وقت ہماری دیرینہ توقعات شرمندہ تعبیر ہو سکیں گی"۔

مولائے حسن ثانی کی قیادت میں مراکش نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کیے، ابھی ان کی حکومت کو صرف آٹھ سال کی مدت گذری ہے، اس مدت میں ملک سیاسی، تمدنی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشی ہر حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو چکا ہے، عوام کے دل اسلامی شعور سے معمور ہیں، اسلامی ملکوں میں مراکش کا وزن و وقار قائم ہو گیا ہے، ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد جب تمام فرمانروا خاموش تھے، تو سب سے پہلے مولائے حسن ثانی ہی کی یہ ایمان افروز صدا فضا میں گونجی:

"یہ شکست ہماری مسلسل بد اعمالیوں کا ثمرہ ہے، اس لیے اب از سر نو اعتصام بحبل اللہ کی ضرورت ہے، جب ہی ہم اپنے دشمنوں پر غالب آسکیں گے، ورنہ ذلت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی"۔

مراکش کا نظام حکومت گو شاہی ہے، لیکن مولائے حسن اپنی اسلامیت، آزادی پسندی اور حریت نواز طبیعت کی بنا پر ملک کے ہر طبقہ میں حد درجہ مقبول ہیں، ان کے عہد میں سب سے زیادہ ترقی تعلیمی میدان میں ہوئی ہے، غلامی کے دور میں ملک میں جہالت اور ناخواندگی عام ہو گئی تھی، کیونکہ فرانس اور اسپین کو مراکشی عوام کی تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ صرف اس ملک کے دفینوں سے اپنے ملکوں کے خزانے بھرنے میں مصروف رہے، لیکن صحیح آزادی ملنے کے بعد خصوصاً مولائے حسن کے عہد میں اس

پسماندگی کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ کی گئی، اور پورے ملک میں ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک کے بکثرت اسکول و کالج قائم کیے گئے۔

مدارس قرآنیہ

موجودہ حکومت نے حسب ضرورت مدارس اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کا کام وزارت اوقاف و شئون اسلامیہ کے سپرد کیا، اس نے چند ہی برسوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی، اور پورے ملک میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دیا، غیر مستطیع طلبہ کے لیے گرانقدر وظائف کا بھی انتظام کیا،

اس سلسلہ میں شاہ حسن کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وزارت اوقاف کو ایسے مکاتب اور مدارس قائم کرنے کی خاص ہدایت کی جو قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوں، تاکہ ملک کے ہر بچہ کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہو جائے کہ قرآن ہی درحقیقت اسلام کا منبع و سرچشمہ اور یہی ہماری حکومت کا اصول و آئین ہے، شاہ کے حسب ایما وزارت نے اس قسم کے ۴۸ مدارس قائم کئے، جس میں اس وقت ۱۲۷ اساتذہ، بارہ سو طلبہ کی قرآنی حقائق کی تعلیم میں مصروف ہیں، اسکے علاوہ بہت سے ایسے گشتی مدرسین کا بھی تقرر کیا گیا، جو دور دراز دیہاتوں میں جاکر بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں،

جامعۂ قرویین

مغرب اقصیٰ کے شہر فاس کی جامعہ قرویین دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، اس کے قیام کو گیارہ صدیاں گذر چکی ہیں، جامعہ ازہر مصر بھی جسے آج سب سے قدیم خیال کیا جاتا ہے، اس کے بعد قائم ہوئی ہے، شہر فاس کو اس یونیورسٹی کی وجہ سے عالمگیر شہرت حاصل ہے، جامعہ ازہر کی طرح یہ بھی ابتداءً ایک عالیشان مسجد میں قائم ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ فاس میں آباد ہونے کے لیے جو خاندان باہر سے آئے، ان میں

شہر قیروان کے ایک متمول تاجر محمد الفہری نامی بھی تھے، انھوں نے انتقال کے وقت دو لڑکیاں فاطمہ اور مریم یادگار چھوڑیں، ان ہی نے اپنے مرحوم باپ کے ترکہ سے جامع قرویین اور جامع اندلس تعمیر کرائیں، فن تعمیر اور صناعی کے لحاظ سے بھی یہ مسجد دنیا کی ممتاز ترین مساجد میں شمار ہوتی ہے،

یہ یونیورسٹی ہر دور میں دینی و اصلاحی سرگرمیوں کا مرکز اور انقلابی و سیاسی تحریکوں کا سرچشمہ رہی ہے، اسی لیے عہد غلامی میں مغربی اقتدار کے جور و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ رہی، کیونکہ یہیں سے حریت و آزادی کی کرنیں پورے مراکش میں پھیلتی تھیں، اس لیے فرانس نے اس کا تعلیمی و تنظیمی ڈھانچہ بہت بدل دیا تھا جس سے جامعہ قرویین کی وہ تمام خصوصیات ختم ہوگئیں جن کی بنا پر وہ دنیا کی دوسری یونیورسٹیوں میں ممتاز تھی،

آزادی کے بعد مولائے حسن ثانی کے عہد حکومت میں جامعہ نے ایک نئے عہد میں قدم رکھا، اس یونیورسٹی میں کلیۃ اللغۃ العربیہ، کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ اصول الدین کے تین کالج پہلے سے موجود تھے، شاہ حسن نے ان کی از سر نو تنظیم کی اور ۱۹۶۳ء میں دار الحدیث الحسنیۃ کے نام سے ایک نیا کالج قائم کیا، اس کے جلسۂ تاسیس کے موقع پر شاہ حسن نے اکابر علما، اور اعیان دولت کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اس اہم شعبہ کے قیام سے ہماری بہت سی دلی تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں، خدا کا شکر ہے کہ آج وہ تمنائیں منت کش تعبیر ہو رہی ہیں، انشاء اللہ العزیز مستقبل میں اس دار الحدیث سے ایمان و ایقان کے سوتے پھوٹیں گے اور ساری قوم اس دور کے گمراہ کن فکری دھاروں سے محفوظ رہے گی، اور اس میں صحیح اسلامی فکر

بیدار ہوگی، آج جبکہ الحاد، کفر اور باطل کی آندھیاں اسلام کے حصن حصین سے ٹکرا رہی ہیں، اس قسم کے ادارہ کی شدید ضرورت تھی ———"

اس دار الحدیث سے تھوڑی سی مدت میں بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں، اس کا ایک خاص کتب خانہ بھی ہے، جس میں تفسیر، حدیث، اصول حدیث، علوم القرآن، فقہ، منطق، جغرافیہ، نحو، لغت، بلاغت، علم الاجتماع اور سیر وغیرہ مختلف علوم و فنون کی چار ہزار سے زائد اہم کتابیں ہیں، پانچ سال کی قلیل مدت میں اس نے جتنی ترقی کی ہے، اسکو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

اس نئی درسگاہ کے علاوہ شاہ حسن نے بہت سے ایسے ادارے بھی قائم کیے جن میں معلمین و اساتذہ اور مبلغین و داعیان اسلام اور خطباء کی ٹریننگ کا انتظام ہے، اور اس وقت جامعۂ قرویین پہلے سے زیادہ مکمل اور اسلامی دنیا کی ممتاز ترین یونیورسٹی ہے،

عصری علوم مولائے حسن سے قبل مراکش میں عصری علوم (سائنس، ٹکنالوجی اور فوجی ٹریننگ وغیرہ) کی طرف کوئی توجہ نہ تھی، شاہ موصوف نے ملک کے استحکام و ترقی کے لیے اس کو بھی خاص اہمیت دی، اور ہونہار طلبہ کو بڑے بڑے وظائف دیکر دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۶۵ء میں ۱۲ طلبہ کو فوجی تعلیم و تربیت کے لیے فرانس بھیجا گیا، اس کے بعد انگلستان، اسپین، اٹلی، جرمنی اور ہالینڈ میں طلبہ کے جانے کا سلسلہ قائم ہوگیا، اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک اپنے دفاع میں دوسرے ملکوں کے فوجی ماہرین کا محتاج نہ رہے، اسی طرح سائنس، ریاضی اور علم طب کو بھی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے،

اعلیٰ تعلیم مراکش میں اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند کرنے کی جانب شاہ کی خاص توجہ ہے، چنانچہ جامعہ محمد خامس کو قائم ہوئے ابھی صرف ۱۲ سال ہوئے ہیں، اس مدت میں اس کے

کالجوں کی تعداد آٹھ سے متجاوز ہو چکی ہے، اس وقت اس یونیورسٹی میں گیارہ ہزار ۳ سو ۷۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں، سال رواں کی رپورٹ کے مطابق اس کے اہم کالجوں میں طلبہ کی تعداد یہ ہے

ٹریننگ کالج ۳۱۲۹ (۷۱۸ طالبات)۔ انجینیرنگ کالج ۲۴۹ (۶ طالبات) طبیہ کالج ۷۸۶ (۱۳۵ طالبات)۔ فیکلٹی آف آرٹس ۳۰۳۹
کلیۃ العلوم ۷۸۸ (۱۰۶ طالبات)۔ کلیۃ الحقوق والعلوم الاقتصادیہ والسیاسیۃ ۴۳۸۵

اس فہرست سے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مراکش کے طبقہ نسواں میں بھی تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے، وہ نہ صرف تدریسی بلکہ ٹیکنیکل اور طبی تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں،

مساجد کی تعمیر مساجد عبادت گاہ کے ساتھ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز بھی ہوتی ہیں، مراکش میں قدیم زمانے ہی سے مسجدوں کی بہت کثرت ہے لیکن عہد غلامی میں فرانسیسیوں نے جہاں ملک کی دوسری خصوصیات کو ختم یا مسخ کر دیا تھا، وہاں مساجد بھی کس مپرسی کا شکار تھیں، چنانچہ آزادی کے وقت ہزاروں مسجدیں شکستہ اور ویران ہو چکی تھیں،

آزادی کے بعد وزارت اوقاف نے ملک گیر پیمانہ پر مساجد کی مرمت اور تعمیر کی طرف توجہ کی، اور پورے ملک میں ہزاروں نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں، صرف ایک مراکش شہر میں گذشتہ آٹھ سالوں میں ۴۸ نئی مسجدیں تعمیر ہوئیں، اس کے علاوہ رباط، سلا، دار البیضا، قنیطرہ، مکناس، فاس، تازا، وجدہ، حسیمہ، تطوان، طنجہ، شادیہ، تا فیلالت، اور اکادیر وغیرہ میں قدیم مسجدوں کی درستگی کے ساتھ بہت سی نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں،

مراکش کی بہت سی مسجدیں صناعی اور حسن و دلکشی کا ایسا مرقع ہیں جن کے سامنے

قرطبہ اور بغداد کا فن تعمیر ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے، بالخصوص رباط کا مأذنہ حسن اور مسجد السنۃ مراکش کی جامع کتبیہ اور فاس کی جامع قرویین اور جامع اندلس اپنی صناعی، تزئین اور شان و شوکت میں بے مثل ہیں،

مأذنہ حسن کا منارہ ۱۱۹۵ء میں جامع رباط الفتح کے لیے تعمیر ہوا تھا، اس کی بلندی ۱۶۵ فٹ ہے۔ **مسجد السنۃ** کو مولائے محمد نے تعمیر کیا تھا، موجودہ حکومت نے اسکی آرائش و زیبائش میں لاکھوں روپئے صرف کیے ہیں، اس کا بلند منارہ، چھتوں کے نقش و نگار، جالی کا کام اور بلند و خوبصورت منبر نگاہ کو دعوت نظارہ دیتے ہیں، **جامع قرویین** بڑی وسیع اور حسین مسجد ہے، اس کے ۱۴ دروازے، ۲۷۰ ستون اور ۲۱ صفیں ہیں جنمیں ۲۲ ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، وسط مسجد میں سنگ مرمر کی نہر جاری ہے،

جامع اندلس فاس میں مریم فہری نے تعمیر کرائی تھی، اس کے منارہ پر رات میں حفاظ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، **جامع کتبیہ** شہر رباط کے مغربی حصہ میں بڑی وسیع اور شاندار مسجد ہے، عہد غلامی میں اس کی حالت خراب و خستہ ہو گئی تھی، اب پھر اس کی سابق شان و شوکت واپس آگئی ہے، اس کے نیچے کئی سو کتب فروشوں کی دکانیں ہیں، خاندان الموحدین کے پہلے فرمانروا مولائے عبدالمومن نے اس کی بنیاد رکھی تھی، اور چوتھے حکمراں مولائے یعقوب المنصور نے اس کی تکمیل کی، اس کا منارہ بلندی اور استحکام کے لحاظ سے ساری دنیا کے میناروں میں ممتاز ہے، یہ منارہ ہفت منزل ہے، اس کی بلندی ۲۷۰ فٹ اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے[1]، سنہ تعمیر ۱۱۹۶ء ہے،

نشر و اشاعت مولائے حسن ثانی کے عہد حکومت میں وزارت اوقاف نے حسب ذیل

[1] دہلی کا قطب مینار ۲۳۸ فٹ بلند اور ½ ۴۷ فٹ چوڑا ہے، اس کا سنہ تعمیر ۱۲۰۰ء ہے۔

اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں :-

(۱) المصحف الحسنی (۲) المدارک چار حصے (۳) التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید لابن عبد البر، ۲ حصے (۴) الاعلام بحدود قواعد الاسلام (۵) کتاب الدروس الحسنیۃ۔ یہ شاہ حسن کے ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے گذشتہ سال رمضان میں دیے تھے۔

ان کے علاوہ وزارت کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ دعوۃ الحق شائع ہوتا ہے، جس میں ملک کے مشاہیر ادبا، اور اہل علم کے معیاری مضامین ہوتے ہیں،

اسلام کی رفتار آزادی کے بعد سے اسلام کے حلقہ بگوش ہونے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، چنانچہ گذشتہ بارہ سالوں میں مختلف ملکوں اور نسلوں کے تقریباً ایک ہزار آٹھ سات افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان میں سب سے زیادہ تعداد (۲۰۹) فرانسیسیوں کی ہے، دوسرا نمبر (۲۵۰) اسپین کا اور تیسرا (۱۵۵) یہودیوں کا ہے، اس کے بعد جرمنی، اٹلی، امریکہ اور پرتگال وغیرہ ممالک علی الترتیب ہیں، جس کی نظیر دوسرے بلاد اسلامیہ میں نہیں مل سکتی، اس سے مراکش میں تبلیغ و دعوت اسلام کے حسن انتظام کا اندازہ ہوتا ہے،

فن تعمیر مغرب اقصیٰ فن تعمیر میں ہمیشہ سے ترقی یافتہ ملک شمار ہوتا ہے، یہاں کے کاریگر اور صناع دوسرے ملکوں میں جاکر اپنی فنی مہارت کی داد لیتے تھے، بغداد کی اعجوبہ روزگار مسجد امام اعظم کی تزیین و آرائش بھی مراکشی حسن ذوق ہی کا نتیجہ ہے، مراکش کا یہ امتیازی وصف آج بھی باقی بلکہ ترقی پذیر ہے، چنانچہ جامع منصور (شہر مراکش) کی محرابیں جامع قرویین (فاس) کا روکار اور مسجد دکار (سینگال) اپنے حسن و جمال نقش و نگار اور فنی نزاکت

میں جامع قرطبہ اور اشبیلیہ کو بھی شرماتے ہیں، خاص طور سے مراکش کے پہلے فرمانروا مولائے ادریس کا مقبرہ تعمیری شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، اسکے در و دیوار پر بڑی مرصع و دیدہ زیب صناعی کی گئی ہے، اس کا فرش اسقدر شفاف و مجلی ہے کہ اس پر مطلا و مذہب چھت کا عکس جگمگاتا ہے، اس کے بالائی کالسنوں پر آیات قرآنی اور قصائد منقبت اتنی خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں کہ نگاہ کو سیری نہیں ہوتی،

اسی طرح مراکش کا قصر بہیہ جس کی تزئین و آرائش میں مولائے عبد العزیز کے وزیر احمد بن موسیٰ نے بڑی دولت صرف کی تھی، اپنی صناعی میں بے مثل ہے، اس کے وسیع دالان، مطلا و مذہب در و دیوار، آرام دہ خواب گاہیں، خوشنما اور نازک بارہ دری، بلند شہ نشین اور دلفریب پائیں باغ مراکشی معماروں کی مہارت فنی اور حسن ذوق کا نمونہ ہیں،

شاہ حسن ثانی کے حسن ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سینگال کی مسجد دکار جس کی تعمیر کی ابتدا مولائے محمد خامس نے بڑے ذوق و شوق سے کی تھی، اس کو مولائے موصوف نے مراکش کے ماہر کاریگروں کی ایک جماعت بھیجکر مکمل کرایا، اس میں ایسا حسین جالیدار کام، مینا کار چھتیں، خوبصورت اور سبک ستون اور مرصع و مزین محرابیں ہیں، جن سے بغداد کے دور عروج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، مولائے حسن نے اس مسجد کے لیے فاس کے بنے ہوئے پچیس بیش قیمت جھاڑ تحفۃً پیش کیے، اور ایک عالیشان آبنوسی منبر نصب کرایا،

یہ آزاد مراکش کی ترقیوں کا اجمالی جائزہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولائے حسن ثانی پورے جوش و انہماک کے ساتھ ملک کی ترقی میں سرگرم ہیں، ان کی یہ کامیابی درحقیقت ان کی اسلام دوستی، علم نوازی، علماء پروری اور خلوص و صداقت کا نتیجہ ہے،

آثارِ علمیہ

علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر[1]

مرتبہ

محمد اقبال مجددی - لاہور

مولانا شبلی مرحوم نے فروری ۱۹۰۱ء کے آخر میں حیدرآباد کا رُخ کیا[2]، ۲۷ مارچ کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں، "یہاں (حیدرآباد میں) ایک بڑا جلسہ میرے لکچر کے لئے ہوا، جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع تھا، لکچر کا سبجکٹ علم کلام تھا، ایک صاحب قلم بند کرتے گئے تھے، چنانچہ جس قدر قلم بند ہوا، چھپ کر شائع ہوگا، اور خدمت اقدس میں پہنچے گا"[3] مولوی سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں :- "..... خود وزیر عدالت صدر انجمن ہوئے، نواب مدارالمہام بہادر[4] یعنی

[1] معارف : یہ لکچر اگرچہ شمسی پریس حیدرآباد میں چھپا تھا، لیکن اتنا نایاب ہے کہ مولانا شبلی کے مجموعۂ خطبات میں بھی جو دارالمصنفین سے شائع ہوا ہے نہیں شامل ہو سکا، اور اس کی قدر و قیمت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی لکچر کے زمانہ میں تھی، اس لئے ایک تاریخی یادگار کے طور پر اسکو شائع کیا جاتا ہے، [2] حیات شبلی ص ۳۵۰ - [3] مکاتیب شبلی حصۂ دوم مکتوب نمبر ۴، [4] یعنی نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ، اقتدار الملک، سر وقار الامرا بہادر مدار المہام دولتِ آصفیہ،

وزیر اعظم نے نہایت احترام سے شرف نیاز دیا[1]،

یہ لکچر مولانا کی کتاب علم الکلام کی اشاعت سے پہلے کا ہے، علم الکلام ۱۹۰۲ء کے اواخر میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع ہوئی تھی، اس لکچر میں دو تین جگہ مولانا نے اپنی اس کتاب کے مسودہ کا ذکر کیا ہے،

مقرر کا تعارف | اگرچہ ہمارا اور ہر مسلمان کا اس پر ایمان ہے کہ اسلام ایک ایسا صاف سیدھا اور سچا مذہب ہے، جس کو نہ کوئی فلسفہ ضرر پہونچا سکتا ہے، اور نہ کسی قسم کے علوم عقلیہ اور اگر ہم ایسا سمجھتے تو کیوں کامل اعتماد کے ساتھ اوس کے بچانے کی فکریں کرتے؟ لیکن ایسا خود سمجھ لینا اور اس پر اعتقاد رکھنا اور بات ہے، اور دوسروں کو سمجھا دینا اور معتقد بنا لینا اور بات، یا یوں کہنا چاہیے کہ فلسفہ یا علوم عقلیہ سے ان عام مسلمانوں کے اعتقاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، جو شرع و دین کے غوامض و اسرار سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے ہیں، اور علم کلام اس نقصان سے مسلمانوں کو محفوظ رکھتا ہے، بہت موٹی بات ہے کہ جب ہمارے متقدمین جن کے نام بتعظیم رحمہم اللہ اور قدس سرہم کے ہم نہیں لیتے، یونانی فلسفہ اور علوم قدیمہ کو جو جدید فلسفہ و علوم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے، اس قابل سمجھے کہ اُن کے بُرے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا، اور اس میں کتابیں مدون کیں، تو اگر آج ہم علوم حالیہ و فلسفہ جدیدہ کے سمی اثر کی طرف اعتنا کریں، اور اس کے لئے تریاق تیار کرنے کی تشویق و تحریک کریں، تو کیوں ضعیف الاعتقاد ٹھہریں، ایسے لوگوں کی اور بات ہے جو ابھی تک بسم اللہ کے گنبد میں ہیں اور نہیں جانتے کہ اسلام اور اسلامیوں پر کیا گذر رہی ہے، اور آئندہ کیا گذرے گی،

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

[1] مکاتیب شبلی بنام مولوی محمد سمیع مکتوب نمبر ۴،

جن معدودے چند بزرگوں نے نئے علم کلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، اُن میں سے ایک اسلامی پرانی تاریخ میں تازی روح پھونکنے کے شیدائی جناب مولانا شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی بھی ہیں، لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کا احساس دانشمندانہ وہمدردانہ ہے، انھوں نے صرف خود سمجھ لینے یا زیادہ سے زیادہ چند دوسرے لوگوں کو سمجھا دینے پر ہی اکتفا کی ہے، بلکہ احساس سے قول اور قول سے گذر کر عمل و فعل میں اس کو جلوہ دیا ہے، مولانائے ممدوح شکر اللہ سعیہ کا وہ لکچر جو انھوں نے ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء کو باغ عامہ میں دیا تھا، چونکہ نئے علم کلام کی واقعی ضرورت کو بتاتا اور اس کا عمدہ نمونہ بھی پیش کرتا ہے، اس لئے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ ایک رسالہ کی شکل میں چھاپ کر شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانان صاحب ہوش و ذوی فہم عموماً اور طبقۂ علما، جو حامی دین و مذہب ہے، خصوصاً اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں، اور صرف معترض بننے پر اکتفا نہ کر کے خیر خواہی اسلام اور حمایت دین خیر الانام کا عملی ثبوت دیں،

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

(مہتمم) محمد ابراہیم خاں اکبر آبادی،

---

۱۱ اردی بہشت سنہ ۱۳۱۰ف مطابق ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء مقام باغ عامہ حیدرآباد

لکچر مولوی محمد شبلی نعمانی

سب سے پہلے میں نہایت ادب کے ساتھ عالیجناب صدر انجمن صاحب[1] کا شکریہ ادا کرتا ہوں

[1] یعنی عالیجناب نواب منیر الدولہ فخر الملک بہادر وزیر عدالت دام مجدہ،

جنھوں نے اس جلسہ میں قدم رنجہ فرما کر میری عزت افزائی فرمائی، اور پھر اُن سب صاحبوں کا جو تکلیف کر کے یہاں تشریف لائے ہیں،

حضرات آج کا میرا خطبہ (لکچر) علم کلام پر ہے یعنی یہ کہ علم کلام کس علم کا نام ہے؟ وہ کب پیدا ہوا؟ کیونکر پیدا ہوا، اس سے کیا نتائج پیدا ہوئے،؟

علم کلام کا ترجمہ انگریزی میں "اسلام اینڈ سائنس" کیا جاتا ہے، فرنچ تصنیفات میں اُس کے لئے "اسکولاسٹیک" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ الفاظ علم کلام کا مفہوم نہیں ادا کرتے،

علم کلام کی تعریف علم کلام کے معنی یہ ہیں کہ مذہب کے عقائد و مسائل کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جائے،

علم کلام کی دو قسمیں ہیں علم کلام کی دو قسمیں ہیں، ایک اندرونی یعنی جو اختلافات باہم مسلمانوں کے پیدا ہو گئے، اور اُن کے متعلق استدلالات اور مباحثات سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے قائم ہو گئے تھے، جن کی تعداد تہتر تک پہونچتی ہے، مثلاً معتزلہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ وغیرہ، ان تمام مذاہب کے باہمی مناظرات کا نام بھی علم کلام ہے، لیکن میں اس وقت اوس سے بحث نہیں کرنا چاہتا.

دوسرا علم کلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ میں قائم ہوا، اور اس وقت میری تقریر کا عنوان یہی علم کلام ہے، اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے، اور اس سے عجیب عجیب معلومات حاصل ہوتے ہیں،

علم کلام کی ابتدا علم کلام کی ابتدا کی تاریخ یہ ہے کہ جب خلافت بغداد میں منتقل ہوئی تو منصور عباسی نے جو ہارون رشید کا دادا تھا، دنیا کی تمام قوموں کی علوم و فنون کی کتابیں

علم کلام

عربی زبان میں ترجمہ کرائیں، اس غرض کے لئے دنیا کے ہر حصہ سے علماء اور مترجمین دربار خلافت میں جمع کئے، اور اُن کو نہایت بیش بہا صلے اور انعامات دیئے، چنانچہ میں نے اپنے ایک رسالہ میں ان واقعات کو بالتفصیل لکھا ہے، اس وقت تفصیلاً بیان کرنے کا موقع نہیں[1]

جب ان علوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کے پڑھنے سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں شبہات اور شکوک پیدا ہوئے، یہاں تک کہ مہدی کے زمانہ خلافت میں جو منصور کا بیٹا تھا، بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مانی کے پیرو ہونگے (یہ مجوسیوں کا ایک مشہور پیشوا اور ایک فرقہ خاص کا بانی تھا) چنانچہ حماد، عجرد وغیرہ نے اس مذہب کی حمایت میں کتابیں لکھیں، یہ حالت اس کی مقتضی تھی اور ممکن بھی تھا کہ ان لوگوں کو سزا دی جاتی، یا اُن کی زبانیں بند کردی جاتیں" یا ترجمہ کا سلسلہ روک دیا جاتا، لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی صدمہ سے اسلام کو ضرر نہیں ہوسکتا، اور کوئی بادِ صرصر اسلام کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی (جیرز) اس لئے خلیفہ مہدی نے روک ٹوک کے بجائے حکم دیا کہ اسلام کے اثبات اور دیگر مذاہب کے رد میں کتابیں لکھی جائیں، یہ علم کلام کے وجود کا پہلا دن تھا،

علم کلام کی ابتدا اور اسکی وجہ تسمیہ کے متعلق ابن خلکان وغیرہ کی غلطی

بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس سے پہلے علم کلام پیدا ہوچکا تھا، جس کا بانی واصل ابن عطا تھا، اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ علم کلام کی پہلی بحث کلام الٰہی کے متعلق تھی، اس لئے

[1] اس رسالہ سے مراد علامہ شبلی کی کتاب علم الکلام ہے، جو اولاً مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی، غالباً ۱۹۰۱ء (اس مضمون کے لکھنے کی تاریخ) تک اس کا دوسرا حصہ الکلام شائع نہیں ہوا ہوگا، اسلئے یہاں حصہ اول کو رسالہ لکھا گیا ہے۔

اس کا نام علم کلام رکھا گیا" لیکن یہ غلطی ہے، علم کلام درحقیقت مہدی کے زمانہ میں پیدا ہوا، اور جیسا کہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے، علم کلام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس علم کو منطق وفلسفہ کا ہم پلہ قرار دیا تھا، اور منطق و کلام ہم معنی الفاظ ہیں

علم کلام کا سب سے پہلا مصنف

اول شخص جس نے علم کلام پر کتاب لکھی ابوالہذیل علاف تھا[2]، علاف کے معنی گھانس بیچنے والا ہے، اس سے آپ خیال کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی پیشہ معیوب نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء ایسے گذرے ہیں جو موچی یا لوہار وغیرہ کا کام کرتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ علماء کو امر حق کے ظاہر کرنے میں عوام کی کچھ پروا نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان کا ذریعہ معاش عوام کی نذر ونیاز پر موقوف نہ تھا، آج کل کے علماء جو بالکل عوام کی مرضی کو دیکھتے رہتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام برگشتہ ہوجائیں تو علماء کے وسائلِ معاش میں فرق آجائے، اس سے آپ یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اوس زمانہ میں علم تھا، یہاں تک کہ موچی اور لوہار وغیرہ بھی بڑے بڑے اہلِ کمال ہوتے تھے، افسوس ہے کہ اب حالت برعکس ہے،

بہرحال ابوالہذیل علاف پہلا شخص تھا جس نے علم کلام پر کتاب لکھی، اس نے بہت سے مناظرات کئے، اور اُن کا یہ اثر ہوا کہ تین ہزار آدمی اس کی زور تقریر سے مسلمان ہوگئے، نہ کہ تلوار سے یا خوف سے یا دباؤ سے (جیرز)

ایک مجوسی میلاس نامی بہت سے مجوسیوں کو ساتھ لیکر آیا، اور کئی دن تک ابوالہذیل سے مناظرہ رہا، انجام کار اُس نے اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ اسلام قبول کیا[3] (جیرز)

[2] ابوالہذیل" کا پورا نام محمد بن الہذیل بن عبداللہ بن مکحول ہے، ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۳۵ھ میں وفات پائی، (ملاحظہ ہو علم الکلام ص ۳۵ طبع آگرہ) [3] ابن خلکان تذکرہ ابوالہذیل علاف،

نظام

دوسرا شخص نظام تھا، جس نے اس علم کو بہت ترقی دی، چونکہ اس علم کی تکمیل کے لئے فلسفہ و عقلیات سے نہایت اعلیٰ درجہ کی واقفیت درکار تھی، اس لئے نظام نے یونانی فلسفہ میں نہایت مہارت حاصل کی، یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اس نے ایک برمکی سے کہا کہ آج کل میں ارسطو کی کتاب "الطبایع" کا رد لکھ رہا ہوں، اس نے کہا کہ ارسطو کی کتاب تم نے دیکھی بھی نہ ہوگی، رد کیا لکھو گے، تو نظام نے جواب دیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں آپ کے سامنے اس کتاب کے اول سے آخر تک پڑھ جاؤں، یا آخر سے اول تک۔[1]

ہارون الرشید نے علم کلام کی تصنیفات کو روک دیا

مہدی کے زمانہ میں یہ حالت رہی، مگر ہارون رشید نے جو یورپ میں الف لیلہ کی وجہ سے بہت مشہور ہے، حکم دیا کہ کوئی شخص علم کلام پر کچھ نہ لکھنے پائے، اس وجہ سے اس قسم کی تصنیفات بالکل بند ہوگئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر قوموں نے طعنے دینے شروع کئے، کہ اسلام دلائل اور براہین سے ثابت نہیں ہوسکتا، مامون الرشید کے زمانہ تک یہ بدنامی عام ہو چکی تھی،

مامون الرشید کا علم کلام کو دوبارہ زندہ کرنا

چنانچہ اس کے رفع کرنے کے لئے مامون الرشید نے حکم دیا کہ ایک عام مجلس مناظرہ قائم کی جائے، جس میں تمام دنیا کے پیشوایان مذہب بلائے جائیں، اور ہر شخص کو بحث و گفتگو کی عام اجازت دی جائے، اس زمانہ میں مجوسیوں کا پیشوائے مذہب، یزداں بخت تھا، چنانچہ وہ رے سے طلب ہو کر آیا، اس کے سوا اور تمام پیشوایان مذہب ہر جگہ سے طلب کئے گئے، اور مسلمانوں کی طرف سے بحث کرنے کے لئے نظام انتخاب کیا گیا، اس معرکہ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا،[2]

---

[1] ملل ونحل ابن مرتضیٰ زیدی ۳۵ [2] اس مناظرہ کا ذکر ابن الندیم نے اجمالاً اور یحییٰ زیدی نے ملل ونحل میں تفصیلاً کیا ہے،

علم کلام سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا اندازہ

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ جو چیز قابل خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے تعصبی اور فراخ حوصلگی ہے، جو کتابیں غیر مذہب والوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہیں، میرا خیال ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوں تو جلادی جائیں، لیکن اس وقت جبریہ روک ٹوک نہیں کی گئی، بلکہ دلائل عقلیہ سے ان کو باطل ثابت کیا گیا جس سے وہ خود ناپید ہوگئیں،

ایک اور امر حیرت انگیز یہ ہے کہ تاریخوں میں یہ واقعات تو ملتے ہیں کہ مسلمان علماء و فقہاء نے بادشاہان اسلام کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھائیں، مثلاً امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ وغیرہ نے قیدیں بھگتیں، اور تازیانے کھائے، لیکن ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ کسی غیر مذہب کے عالم کو اسلامی حکومت میں کچھ تکلیف پہونچی ہو، سلسلۂ بیان میں مجھے ایک بات یاد آگئی، اور خواہی نخواہی کہنا پڑتا ہے، کہ میری کتاب الفاروقؓ جب شائع ہوئی تو مسٹر آرنلڈ نے جو ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں، اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا، اور لندن میں "ہیروز" کے سلسلہ میں داخل کرانے کی تحریک کی، چنانچہ اڈیٹر سے اس معاملہ میں خط و کتابت کی، دو مہینے کے گذرنے پر جواب ملا کہ ایسی کتاب کا چھاپنا جو فاروقؓ کے حالات میں ہے "ہماری پالیسی کے خلاف ہے"، حالانکہ اڈیٹر نے کتاب مذکور کو آنکھ سے دیکھا تک نہ تھا،

اس کے مقابلہ میں یہ واقعہ لحاظ کے قابل ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں یعقوب کندی نے ایک مسلمان رئیس کو اسلام کے متعلق جو خط لکھا اور جس میں نہایت گستاخی سے اسلام پر حملے کئے، مامون الرشید کے سامنے جب وہ خط پیش ہوا تو اس نے صرف یہ کہا کہ مذہبی خیال میں کسی پر جبر نہیں ہوسکتا، "لا اکراہ فی الدین"، چیرز

طرّہ یہ کہ یورپ والے باوجود اس کے ہم مسلمانوں کو متعصب اور تنگ خیال کہتے ہیں،
مسلمانوں کی بے تعصبی، روشن ضمیری، فراخ حوصلگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ
انھوں نے غیر قوموں کے علوم و فنون کے ساتھ وہی محبت اور دلچسپی ظاہر کی جو ان کو خود اپنے
ذاتی علوم و فنون کے ساتھ تھی، وہ یونانی طب کو اپنا علم طب سمجھتے تھے، یہاں تک کہ آج
ہمارے ہاں کے قدیم حکیموں سے جب کہا جاتا ہے کہ طب یونانی کی بہت سی غلطیاں
ثابت ہوئیں، تو وہ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، گویا یہ علم خود انہی کا اور ان کے موروثوں
کا علم ہے،

درس نظامیہ میں جس قدر کتابیں منطق اور فلسفہ کی شامل ہیں، اتنی خاص اسلامی
علوم کی نہیں ہیں، تفسیر و فقہ کی صرف چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن منطق و فلسفہ کا یہ
حال ہے کہ صغریٰ و کبریٰ سے شمس بازغہ تک اُن کا سلسلہ چلا جاتا ہے،

مسلمانوں کی بے تعصبی اس قدر بدیہی واقعہ تھا کہ یورپ مشکل سے اس کا انکار کر سکتا تھا،
اس لئے یورپ نے بجائے اُس کے ایک دوسرا اعتراض قائم کیا اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے یونانی
فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی، مسٹر ڈریپر نے لکھا ہے کہ "مسلمان درحقیقت ارسطو کی گاڑی کے
قلی ہیں"

یورپ کے اس اعتراض کا جواب کہ مسلمانوں نے فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی

افسوس یہ ہے کہ یورپ نے ہمارے علم کلام کی کتابیں نہیں
پڑھیں ورنہ وہ دیکھتا کہ ہم ارسطو کے فلسفہ کو ہیچ سمجھتے تھے
اور ہم نے دلائل سے اس کو ہیچ ثابت کیا تھا آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ منطق جو ایک ایسا یقینی
علم ہے جیسے گرامر اور اس کا رد بظاہر ممکن نہیں، مسلمانوں نے نہایت باریک بینی سے اس کی
نکتہ چینی کی، علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الرد علی المنطق" جو کئی سو صفحوں میں ہے آجکل

میرے استعمال میں ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اس کا ترجمہ یورپ میں شائع کیا جائے
تو یورپ کی آنکھیں کھل جائیں،

فلسفہ کے خلاف مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور دو حیثیت سے لکھا ہے، اول یہ کہ
وہ مسئلہ فلسفی حیثیت سے صحیح ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ مذہب کے مسائل سے مطابق ہے یا نہیں،
مثلاً فلاسفر کہتے ہیں کہ خدا خود اپنے اختیار سے کوئی فعل نہیں کرتا، بلکہ بلا اختیار تمام افعال اس سے
سرزد ہوتے رہتے ہیں جس طرح آفتاب سے بلا اختیار روشنی پیدا ہوتی ہے، یہ عقیدہ مسلمانوں
کے اعتقاد کے خلاف تھا، اس لئے علم کلام میں اس کو نہایت قوی دلائل سے باطل ثابت
کیا گیا،

اس طرح اور بہت سے عقائد تھے، اور ان تمام مسائل میں مسلمانوں نے ارسطو کی غلطیاں
ثابت کیں، یہ علم کلام کا ایک نہایت مختصر نمونہ اور اس کی تاریخ ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ آجکل
ہم کو مذہب کی حفاظت کے لئے علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں اور ہے تو وہی قدیم علم کلام
کافی ہے، یا ایک دوسرا علمِ کلام درکار ہے،

آج کل علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی حفاظت کے سامان
کی آج کل جس قدر ضرورت ہے کبھی کسی زمانہ میں نہ تھی،

قدیم زمانہ میں اوّلاً تو تربیت کا ایسا طریقہ تھا جو خود مذہب کی حفاظت کے لئے کافی تھا،
ایک مسلمان بچہ جب مکتب میں بیٹھتا تھا، تو اُس کو اُس کا اُستاد مذہب کی مجسم تصویر نظر آتا تھا،
بچہ کی ناروا باتوں پر ناجائز، منع، حرام، مکروہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے، اور
یہ مختصر الفاظ فقہ کے بڑے بڑے مفصل احکام کا کام دیتے تھے، غرض چونکہ ابتدا ہی سے بچے مذہبی
قالب میں ڈھالے جاتے تھے، اس لئے جوان ہو کر وہ بالکل مذہبی بن جاتے تھے،

اگر شاذ و نادر فلسفہ وغیرہ کے اثر سے مذہب میں تزلزل پیدا ہوتا تھا تو علم کلام کی شمار
تصنیفات موجود ہوتی تھیں لیکن آج دو باتوں میں سے ایک بھی نہیں،

تربیت تو اس لئے نہیں کہ اسکولوں اور مدرسوں میں مذہبی پابندی اور مذہبی خیالات کا
نام نہیں لیا جا سکتا، جو گورنمنٹ ہم پر حکومت کر رہی ہے، اس کی رعایا میں مختلف مذاہب کے لوگ
داخل ہیں، اور اس لئے وہ کسی مذہب کی تخصیص نہیں کر سکتی، اور درحقیقت اس کو کرنا بھی نہیں چاہئے
اسی ضرورت کے لئے مسلمانوں نے علی گڑھ میں اپنا مدرسہ الگ قائم کیا اور اگر یہ ضرورت اچھی
اہتمام پا جائے، تو دنیا میں کوئی چیز مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی،

قدیم علم کلام کا آج کل ناکافی ہونا

علم کلام کا یہ حال ہے کہ قدیم علم کلام جو طیار ہوا تھا، وہ فلسفہ قدیم
کے مقابلہ میں تھا اب سیکڑوں نئے مسائل پیدا ہو گئے، جن سے مسلمانوں
کے عقائد پر اثر پڑتا ہے اور ان کے دفعیہ کا کوئی سامان نہیں، مصر و شام میں بعض علما نے نیا علم
کلام مرتب کرنا چاہا، مثلاً حسین جسر نے حمیدیہ نام کتاب لکھی، ایک اور مصنف نے الدلیل
الصادق" ایک بڑا رسالہ لکھا لیکن چونکہ یہ علما یورپ کے علوم سے بالکل ناآشنا ہیں اسلئے
وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے سروپا لکھتے ہیں،

ایک بڑے عالم نے فرمایا کہ خوردبین اور دوربین میں شیشوں سے جو کچھ نظر آتا ہے
اور جس کی بنا پر یورپ والے آسمان وغیرہ سے انکار کرتے ہیں وہ واقعی نہیں ہوتا، بلکہ صرف
شیشہ کا اثر ہے جس طرح سبز عینک سے تمام چیزیں سبز نظر آتی ہیں، اور سرخ سے سرخ،
آج کل جو لوگ نیا علم کلام مرتب کرنا چاہتے ہیں، ان میں صرف ایک شخص فرید وجدی ہیں
جو فرنچ زبان کا بڑا ماہر ہے، اس نے اسلام کے ثبوت میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں، اور
نہایت مدلل لکھی ہیں: وہ ایک ماہواری رسالہ بھی نکالتا ہے، جس میں علم کلام کی

بحثیں ہوتی ہیں،

اس قابل مصنف کے نمونہ پر میں نے ایک نہایت مفصل کتاب لکھنی شروع کی ہے، جس کے
دو حصے قرار دیئے ہیں، پہلے حصہ میں قدیم علم کلام کی نہایت مفصل تاریخ اور اس پر ریویو ہے دوسرے
حصہ میں جدید علم کلام کے مسائل ہیں،

اس دوسرے حصہ میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا ہے، کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے،
پھر نہایت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے، کہ تمام مذاہب موجودہ پر اسلام کو کیا ترجیح حاصل ہے، چنانچہ
اس موقع پر میں اپنی کتاب کے چند صفحے آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں،

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس نکتہ کے سمجھنے سے پہلے انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو، حیوان اپنی
تمام ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اس کا لباس
ان کے ساتھ ہوتا ہے، جو موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے
لئے پنجہ ناخن، ڈنک کے ہتھیار، ان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جن غذاؤں پر اس کی زندگی
کا مدار ہے، پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو
یا آبادی ہر جگہ مہیا ملتی ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان
اس کے پاس مہیا نہیں ہوتا، اس کی جلد نازک ہوتی ہے، ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر
کوئی لباس نہیں ہوتا، دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے، اس کے ساتھ
عالم فطرت کی جتنی چیزیں اس کے گرد و پیش ہوتی ہیں، سب کی سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں،
آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو
نابود کر دے، یہ معنی ہیں، قرآن کی اس آیت کے "خلق الانسان ضعیفا"
ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی ہتھیار

نہیں دیا، کیونکہ جن بے شمار اور پُرزور دشمنوں کو اُس کا سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی، جس نے ہر مخالف کے مقابلہ کا جدا سامان تیار کیا، دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ و خنجر طیار کئے[1]، دریاؤں پر پُل باندھے، پہاڑ تراشے، لوہا پگھلایا، برق کو مسخر کیا، ہوا کو تھاما، غرض تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی، اس عام قوت کا نام عقلِ کُلّی یا عقلِ انسانی ہے،

لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر ٹھہرنے نہ پائیں، اس لئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی، وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے ہر انسان پر نئے نئے طرح کے حملے کئے جاتے ہیں، جن بیماریوں کا علاج معلوم ہوچکا تھا، اُن کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں، دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہوچکا تھا، اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے، اور وہاں نئی ضروریات پیش آتی ہیں، آرام و آسایش کے جو سامان ہوچکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھکر وہ سامان بے کار ہوجاتے ہیں، مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی طیاریاں[1] کرتا ہے، اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا، اس سے آگے نکل جاتا ہے، عالم کون اور انسان کی یہی باہمی کشمکش وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے، اور جس کی بدولت آج

[1] تیار اور تیاریاں اس لکچر میں ہر جگہ "ت" کی بجائے "ط" سے لکھا گیا ہے، مولانا شبلی مرحوم کی دیگر کتابیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں، یہ الفاظ اسی طرح چھپے ہیں، نیز اردو کی بعض قدیم کتابوں میں بھی تیار کو طیار لکھا گیا ہے، محمد اقبال مجددی

یورپ میں سیکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہے، اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ بحث اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے، اور جن سے انسان کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں، طمع اس کو آمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ دوست و دشمن دور و نزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کرلیا جائے، کینہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے، جاہ طلبی کہتی ہے جب تک تمام عالم کی گردنیں جُھک نہ جائیں، آرام نہ لے، ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہے، وہ بتاتی ہے، کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کروگے، تو وہ بھی کرے گا، تم کسی کو برباد کرنا چاہوگے تو وہ بھی چاہے گا، تم دوسروں کی عزت نہ کروگے تو وہ بھی نہ کریں گے، لیکن اول تو اس قسم کی پیش بینی اور انجام بینی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں، جہاں اس قسم کے مسائل انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا، حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ، ایک چیز بھی نہیں ہوتی، ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہے، اور انسان کو ان دشمنوں کے حملہ سے بچاتی ہے اس قوت کا نام نورِ ایمان، کانشس، حاسۂ اخلاقی ہے، اور یہی مذہب ہے،

یہ قوت اس کی اصل فطرت میں داخل ہے، عالم و جاہل، رذیل و شریف، شاہ و گدا، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں) یہی معنی ہیں قرآن کریم کی اس آیت کے "فاقم وجھک للدین حنیفاً فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون[1]،

[1] یہ نکتہ تیرہ سو برس کے بعد اب یورپ کے حکما کے خیال میں آیا،

جرمن کا ایک حکیم لکھتا ہے کہ مذہب ابدی چیز ہے، کیونکہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا" فرانس کا مشہور فاضل علم رینان اپنی کتاب "تاریخ مذاہب" میں لکھتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیاء جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں، اور کل وہ چیزیں جو بنا 'زندگی' میں محبوب ہو سکتی ہیں، مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے، یا اُس کی قوت میں زوال آجائے، وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دے گا، کہ مادی مذہب (میٹریلزم) بالکل غلط ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے"

پروفیسر سپنسر "فلسفۂ دینیہ" میں لکھتا ہے "میں کیوں پابند مذہب نہ ہوں، اس لئے کہ اس کے خلاف میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے، میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا، ؟ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے، اس سے زیادہ تمام انسانی سوسائٹی کو ہے، مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالی گئی ہیں، لیکن یہ جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے، اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کرلئے ہیں، اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے، جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی، مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے جاتے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوتی ہے اور اسی سے قوت پائے گی"

دنیا افراد انسانی کی خاص خاص مخصوصات یعنی زبان، قوم، ملک، صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ، تو جو چیزیں مشترک رہ جائیں گی، ان میں ایک مذہب ہوگا، اور یہ اس

بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، جن چیزوں کو ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں، مثلاً اولاد کی محبت انتقام کی خواہش کمال کی قدردانی، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں، اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم ہر طبقہ ہر نسل کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب انسان کی فطری چیزوں میں شمار نہ کیا جائے، صرف اسی قدر نہیں بلکہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں، وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں، خدا کا وجود اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت اعمال کی جزا و سزا، رحمدلی ہمدردی، عفت کو اچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو بُرا جاننا تمام دنیا کے مذہبوں کا اصل اصول ہے،

فطرت نے افراد انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے، دولت و مال، جاہ و حشم، فضل و کمال، ذہن و ذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی، سکندر و تیمور، ارسطو و افلاطون، ہومر و فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں، دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے، کہ ڈارون کو نظر بھی نہیں آتا، باایں ہمہ جو باتیں شریفانہ زندگی اور مدار حیات ہیں، وہ تمام افراد انسانی کو یکساں عطا کی ہیں، افریقہ کا جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا، سوتا، جاگتا، بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا، اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا، ارسطو اور مہتم بہت سے دلائل کے بعد جس نتیجہ تک پہونچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، علم، اچھی چیزیں ہیں، لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر کسی تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا ہے، اور اچھا سمجھتا ہے،

ان تمام باتوں سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ نفس مذہب اور مذہب کے مقدم اصول فطری چیزیں ہیں، جو انسان سے جدا نہیں ہوسکتیں اور جو لوگ اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں وہ گویا اصول فطرت کو توڑنا چاہتے ہیں؎

لکچرار نے یہاں پہونچ کر کہا کہ افسوس میں بالکل تھک گیا، اور اس وجہ سے اس مضمون کا وہ حصہ جس میں خاص مذہب اسلام کی صحت اور ترجیح کا ذکر ہے نہیں پڑھ سکتا۔

؎ معارف :- الکلام میں قریب قریب یہ پورا حصہ موجود ہے، مگر اس وقت یہ کتاب مسودہ کی شکل میں تھی، اس لئے بعد میں جا بجا الفاظ کا ردو بدل ہے، بلکہ بعض پیراگراف بھی جو اس لکچر میں نہیں ہیں، بڑھائے گئے ہیں، اور تقریر کا آخری پیراگراف الکلام میں نہیں ہے،

مطبوعات جدیدہ

مآثر الامراء: مترجمہ پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات: ۹۲۴ مجلد مع گردپوش، قیمت: ۱۵ روپے، پتہ :- مرکزی اردو بورڈ - ۳۶ - جی گلبرگ لاہور، پاکستان،

صمصام الدولہ میر عبدالرزاق شاہنواز خان (م ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء) محمد شاہی عہد کے نامور امیر تھے، اورنگ آباد (دکن) کے نواب آصف جاہ اول اور اُن کے فرزندوں نظام الدولہ اور صلابت جنگ وغیرہ کی سرکار میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے، سرکاری مشغولیتوں کے باوجود علمی ذوق اور فارسی ادب و انشاء کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے، سیر و تاریخ پر اُن کی نگاہ بڑی وسیع تھی، ان کی تصنیفات میں مآثر الامراء زیادہ اہم اور مشہور ہے، جو اکبر سے محمد شاہ کے زمانہ تک کے سات سو تیس امراء اور سرداروں کے حالات اور اُن کے علمی و انتظامی کارناموں اور دوسرے ضمنی دلچسپ اور متفرق معلومات پر مشتمل ہے، ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے دو لائق اساتذہ مولوی عبدالرحیم اور مرزا اشرف علی خان نے اس کا مکمل فارسی متن ترتیب و تصحیح کے بعد تین ضخیم جلدوں میں، اور اس کی مفصل فہرست مضامین، اور اسماء، اعلام اور بلاد و اماکن کا اشاریہ ایک مستقل جلد میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا تھا، مآثر الامراء کا انگریزی اور اس کے بعض حصوں کا ہندی ترجمہ بھی پہلے چھپ چکا ہے، اب پاکستان کے مشہور صاحب قلم محمد ایوب صاحب قادری نے جن کو تاریخ ہند اور فن سیر و تراجم سے خاص ذوق اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کرنے کا اچھا

سلیقہ سے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، زیرِ نظر کتاب پہلی جلد کا ترجمہ اور تیموری دور کے دو سو پندرہ ۲۱۵ امراء کے حالات و کارناموں پر مشتمل ہے، اس میں ایشیاٹک سوسائٹی کے مندرجات و فہارس کے علاوہ فاضل مترجم نے شروع میں مصنف کے مختصر حالات اور مآثر الامراء کا مبسوط تعارف اور آخر میں مغل فرمانرواؤں کے سالہائے جلوس کی فہرست اور فٹ نوٹ میں انگریزی مترجم کے حواشی اور کہیں کہیں خود بھی مختصر معلوماتی حواشی کا اضافہ کر دیا ہے، اس سے اس کا افادہ بڑھ گیا ہے، یہ کتاب تیموری عہد کے تقریباً دو سو سالہ واقعات اور اس دور کے قدیم خاندانوں کے متعلق مستند معلومات کا ذخیرہ اور تاریخ ہند کے سلسلہ میں ایک معتبر ماخذ ہے، اس کے ترجمہ سے اردو کے سوانحی و تاریخی ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے، اس کے لئے مترجم اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں،

نئے مشاہدات اور معجزہ شق القمر

مرتبہ مولانا معین الدین رہبر فاروقی متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت، قدرے بہتر صفحات ۳۰۸،

قیمت: [illegible] مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی، مارکٹ حیدرآباد سے اور مصنف سے بیرون یاقوت پورہ محلہ املی بن ۱۷-۳-۴۰۵، حیدر آباد (۲۳) آندھرا پردیش کے پتہ سے مل سکتی ہے،

اس کتاب میں معجزہ کی حقیقت اور عام معجزات خصوصاً معجزہ شق القمر پر بحث کی گئی ہے، اور چاند کے متعلق موجودہ تحقیقات اور خلائی مشاہدات کی تفصیل اور انشقاق قمر سے متعلق آیات کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اور اس معجزہ کے منکرین کو گمراہ اور کافر کہا گیا ہے، بلاشبہ قرآن کے نص صریح کا منکر کافر ہے لیکن انشقاق قمر کی آیتیں معجزہ شق القمر کے باب میں صریح نہیں ہیں، بلکہ وہ قیامت کے احوال پر بھی منطبق ہوتی ہیں، علمائے سلف میں بھی اس رائے کے علماء گذرے ہیں، ایسے محتمل نص کی بنیاد پر تکفیر بڑی جسارت ہے، پھر موجودہ خلائی مشاہدین نے چاند میں جن غاروں

اور گڑھوں کا انکشاف کیا ہے، ان کو قرآن کے لفظ انشقاق سے کوئی مناسبت نہیں، اس معجزہ کے آثار و نشانات کے باقی رہنے پر جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے، اس کی تعبیر میں مصنف سے سخت سہو ہوا ہے، اسی طرح عام معجزات کے آثار کے بقا کی جو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں کشتی نوحؑ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، اور حضرت مسیحؑ کے بنائے ہوئے پرندہ کے موجود ہونے کی خود مصنف کوئی قرآنی شہادت نہیں پیش کر سکے ہیں، صرف رطب و یابس تفسیری اقوال کا سہارا لیا گیا ہے، سورۂ رعد کی آیتوں میں بھی معجزات کے آثار کے بقا کا کوئی ثبوت نہیں ہے یمحو اللہ ما یشاء و یثبت کا خصوصی مفہوم لینے کی صورت میں بھی مصنف کا مدعا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس صورت میں اس سے ظہور معجزات کے قدیم قانون کے محو و اثبات کی طرف اشارہ ہوگا، ص ۱۰۱ تا ۱۰۶ میں مختلف عنوانات کے تحت آیاتِ قرآنی سے جو قضایا و مقدمات ترتیب دئے گئے ہیں، ان میں سے بعض کا ثبوت محلِ نظر اور بعض سرے سے ثابت ہی نہیں، ص ۹۰ پر "ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" میں کتاب مبین سے قرآن مراد لینا صحیح نہیں ہے، ص ۲۰۴ تا ۲۰۶ میں معجزہ شق القمر کے بعد کفار کو عذاب نہ دیئے جانے کا جو وجوہ تحریر کئے گئے ہیں، انکو اگر درست مانا جائے تو معجزہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، آخری باب میں ان ملکوں کے ذکر میں جن میں اس معجزہ کا مشاہدہ کیا گیا تھا، ہندوستان کے جن اشخاص کے مشاہدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تاریخی حیثیت سے مستند نہیں، اور نہ ان لوگوں کی رسول اللہ سے معاصرت ہی یقینی طور پر ثابت ہے، یہ کتاب خلائی مشاہدات اور موجودہ تحقیقات سے قرآنی بیانات کی تصدیق کے لئے لکھی گئی ہے، اس لئے اس کو مدلل ہونا چاہیئے تھا، کمزور محتمل اور غیر مسلّم امور پر یقینیات کی بنیاد نہیں رکھی جاتی، بعض مباحث میں تکرار اور انداز بیان میں بھی الجھاؤ ہے، تاہم کتاب بڑی محنت و کاوش اور نیک جذبہ سے لکھی گئی ہے،

مقالاتِ احسان: مرتبہ جناب مرزا احسان احمد صاحب بڑی تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ،

صفحات ۴۷۹، قیمت عہ، پتہ :۔ دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۔ (یو۔ پی)

ہمارے شہر کے نامور شاعر مرزا احسان احمد صاحب وکیل چمنستان شبلی کے دیرینہ نواسنج ہیں، ان کا اور مولوی اقبال احمد خاں سہیل مرحوم کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، ایک زمانہ میں ان دونوں کے ذوق سخن کی وجہ سے اعظم گڈھ کی سرزمین شعر و سخن کے ترانوں سے معمور رہتی تھی، مرزا صاحب کے خیالات بلند، ذہن نکتہ سنج، اور ذوق نہایت ستھرا ہے، انھوں نے نہ صرف شعر و سخن کی زمین میں گل بوٹے کھلائے ہیں، بلکہ ادب و تنقید کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، وہ کم کہتے اور کم لکھتے ہیں لیکن جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ ادب و انشا کا دلکش نمونہ ہوتا ہے، انھوں نے گذشتہ نصف صدی کے اندر بہت سے ادبی و تنقیدی مضامین لکھے جو معارف اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوئے، اب انھوں نے اس کا مجموعہ شائع کیا ہے، جو سولہ مضامین پر مشتمل ہے، مرزا صاحب کے نزدیک غزل گو شاعر کیلئے صاحب ذوق فنکار ہونے کے ساتھ حسن و عشق کا عظمت شناس، صاحب درد اور بیدار قلب ہونا بھی ضروری ہے، اسی معیار پر انھوں نے ماضی قریب کے اکابر غزل گو شعراء کے کلام کو جانچا ہے، اور اصغر، جگر اور سہیل کے محاسن کلام اور فانی کی شاعری کے معائب دکھائے ہیں، مصنف مولانا شبلیؒ، اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے خاص عقیدتمندوں میں ہیں، اس لئے ان دونوں کے فارسی کلام کی خصوصیات اور علامہ شبلیؒ کے تحقیقی کارنامون پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اردو شاعری" اور "قدیم مذاق سخن کے معائب" میں جدید رجحانات کا خیر مقدم اور فرسودہ انداز سخن کی مذمت کی گئی ہے مرزا صاحب کا مذاق تغزل بڑا لطیف ہے، اور وہ نوحہ و ماتم، گور و مرقد اور سوقیت و ابتذال کو غزل جیسی لطیف اور پاکیزہ صنف سخن میں گوارا نہیں کرتے، اس لئے لکھنؤ اسکول کے طرز پر کم و بیش ہر مضمون میں تنقید کی گئی ہے، اور ایک مضمون نواب جعفر علی خاں اثر کے رد و قدح میں ہے، مصنف کا اصل میدان شعر و سخن ہے، لیکن ایک مضمون مشہور افسانہ نگار ایم اسلم کی افسانہ نگاری کی خصوصیات پر بھی ہے، اب تنقید کا انداز بہت بدل گیا ہے، اس لئے بعض نئے ناقدین کیلئے مرزا صاحب کے بعض آراء و خیالات پر تنقید کی گنجائش نکل سکتی ہے، ادبی حیثیت سے یہ مضامین دلکش اور بصیرت افروز ہیں،

"ض"

جلد ۱۰۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۹ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد